ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ



پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ
۲۰۲۰۰۱

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا سہ ماہی ترجمان

تحقیقات اسلامی

علی گڑھ

اکتوبر ـــــــــ دسمبر ۲۰۰۰ء

ـــ: ایڈیٹر :ـــ

سید جلال الدین عمری

پاٹ والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ

۲۰۲۰۰۱

سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ

جلد ۱۹ شمارہ ۴

اکتوبر ـــــــــ دسمبر ۲۰۰۰ء

رجب ـــــــــ رمضان ۱۴۲۱ھ

زرتعاون

اندرون ملک	فی شمارہ	۲۰ روپے
	سالانہ	۷۵ روپے
لائبریری وادارے	سالانہ	۱۰۰ روپے
بیرون ملک (انفرادی)	"	۳۵۰ روپے
(ادارے)	"	۵۰۰ روپے
پاکستان (انفرادی)	"	۱۵۰ روپے
(ادارے)	"	۲۰۰ روپے

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس علی گڑھ کے لیے مزید پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرفِ آغاز

ہجرتِ حبشہ	سید جلال الدین عمری	۵

تحقیق وتنقید

تخریج احادیث - ایک تعارف	حافظ افتخار احمد	۳۱
آثار البلاد - فنِ تراجم کا ایک اہم ماخذ	ڈاکٹر جمشید احمد ندوی	۴۶

بحث ونظر

حالتِ نشہ کی طلاق	مولانا ولی اللہ مجید قاسمی	۵۹

ترجمہ وتلخیص

سیرت نگاری کی تاریخ پر ایک نظر	مصطفیٰ السقا، ابراہیم الابیاری عبدالحفیظ شلبی ترجمہ: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۷۲
علی ابن مدینی - احوال اور علمی آثار	ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی ترجمہ: مولانا محمد اسلام عمری	۹۷

تعارف وتبصرہ

الرای الصحیح فی من ھو الذبیح	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۱۱۲
علوم الحدیث - مطالعہ وتعارف	مولانا محمد جرجیس کریمی	۱۱۳
سہ ماہی "حرا" حیدرآباد	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۱۱۵
خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی	"	۱۱۶
سالانہ فہرستِ مقالات سہ ماہی تحقیقات اسلامی سنہ ۲۰۰۰ء		۱۱۷

اس شمارہ کے لکھنے والے

۱۔ حافظ افتخار احمد ——————

لکچرر شعبۂ علوم اسلامیہ، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور، پاکستان

۲۔ ڈاکٹر جمشید احمد ندوی ——————

ریسرچ ایسوسی ایٹ، شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۳۔ مولانا ولی اللہ مجید قاسمی ——————

استاذ جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ

۴۔ مصطفیٰ السقا، ابراہیم الابیاری، عبدالحفیظ شلبی ——————

مصری محققین

۵۔ ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی ——————

استاذ جامعۃ الملک سعود، ریاض، سعودی عرب

۶۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی ——————

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی علی گڑھ

۷۔ مولانا محمد اسلام عمری ——————

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی۔ علی گڑھ

۸۔ مولانا محمد جرجیس کریمی ——————

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی۔ علی گڑھ

۹۔ سید جلال الدین عمری ——————

سکریٹری ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی۔ علی گڑھ

خوش نویس:

ابن سیف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

ہجرتِ حبشہ[1]

سید جلال الدین عمری

مکہ میں اسلام کی دعوتِ عام شروع ہوئے ابھی دو ہی سال گزرے تھے کہ فضاؤں میں ارتعاش پیدا ہوگیا، ایک ہلچل سی مچ گئی اور دعوت کو جاری رکھنا دشوار سے دشوار تر ہوتا چلا گیا۔ جو اصحاب اسلام قبول کر رہے تھے ان کے لیے زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تنگ ہونے لگی۔ ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اہم اور دور رس اقدامات کیے ان میں ایک اہم قدم یہ تھا کہ آپ نے صحابہ کرامؓ کو حبشہ ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا۔ یہ بعثت کے پانچویں سال کا واقعہ ہے[2]۔

ہجرتِ حبشہ اسلام کی دعوت کی راہ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اسے کسی قدر تفصیل سے پیش کیا جا رہا ہے۔

ملکِ حبشہ

حبشہ ایک بڑی سلطنت تھی۔ اس کے حدود دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:۔

ملکِ حبشہ یمن کے مغربی جانب واقع ہے۔ اس کی مسافت کافی طویل ہے۔ یہ کئی

---

[1] یہ ان مقالات کی ایک کڑی ہے جو سیرت کے کسی دور سے متعلق تحقیقات اسلامی میں مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو جلد ۱۹ کے شمارے ۱، ۲، ۳ جنوری۔ مارچ، اپریل جون، جولائی ستمبر ۲۰۰۰ء

[2] علامہ ابن اثیر کہتے ہیں۔ وکان مسیرھم (ای الی الحبشۃ) فی رجب سنۃ خمس من النبوۃ وھی السنۃ الثانیۃ من إظہار الدعوۃ۔ الکامل: ۱/۵۹۶

اجناس (قوموں) پر مشتمل ہے۔ سوڈان کے تمام فرقے حبشہ کے بادشاہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں وہاں کے بادشاہ کو نجاشی کہا جاتا تھا۔ اب اسے حَطِی کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حبش بن کوش بن حام کی اولاد ہیں[۱]

ہجرتِ حبشہ کا پس منظر

ہجرتِ حبشہ جن حالات میں ہوئی اس کی تصویر کشی امام زہری نے اس طرح کی ہے:

جب مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی، ایمان کا برملا اظہار ہونے لگا، اس پر بحث وگفتگو کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا تو قریش نے سخت رویہ اختیار کیا۔ قبائل قریش میں سے جس قبیلہ کے بھی افراد ایمان لاتے ان پر (بالعموم) پورا قبیلہ ٹوٹ پڑتا، انھیں شدید اذیتیں پہونچائی جاتیں، قید وبند میں رکھا جاتا اور انھیں اسلام سے پھیرنے کی کوشش کی جاتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حالات میں صحابہ کرامؓ سے کہا کہ وہ مکہ سے کسی دوسری جگہ چلے جائیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کہاں جائیں؟ آپ نے حبشہ کی طرف اشارہ فرمایا۔ ہجرت کے لیے آپ دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں اسے زیادہ پسند فرماتے تھے۔ اس کے بعد بہت سے مسلمانوں نے حبشہ ہجرت کی[۲]

مزید تفصیل ابن اسحٰق کے ہاں ملتی ہے۔ کہتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ آپ کے اصحاب سخت مصائب اور مشکلات میں گرفتار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ کو جو مرتبہ ومقام حاصل تھا اس کے باعث اور آپ کے چچا ابوطالب کو آپ سے جو قلبی تعلق تھا اور آپ کو جس عزت واحترام سے وہ دیکھ رہے تھے، اس کی وجہ سے آپ ان مشکلات سے (کسی قدر) محفوظ ہیں۔ آپ کے صحابہ جن حالات سے گزر رہے ہیں اور جس طرح کی شدید تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں ان میں آپ ان کی مدد بھی نہیں کر پا رہے ہیں تو آپ نے ان سے کہا کہ وہ حبشہ

---

[۱] ابن حجر: فتح الباری: ۷/۵۸۷

[۲] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۰۳-۲۰۴۔ السیرۃ الحلبیۃ: ۲/۳

ہجرت کر جائیں، اس لیے کہ وہاں کا بادشاہ عدل پسند ہے، اس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔ حبشہ 'ارض صدق' (سچائی کی زمین) ہے۔ وہ وہاں اس وقت تک رہیں جب تک اللہ تعالیٰ کوئی سبیل نہ نکال دے۔ اس کے بعد مسلمان حبشہ ہجرت کرنے لگے۔ یہ ہجرت، دین کی راہ میں فتنہ کے خوف سے تھی، یہ اپنے دین کی خاطر اللہ کی طرف ہجرت تھی۔ یہ اسلام کے لیے سب سے پہلی ہجرت تھی[1]

مہاجرین حبشہ کا پہلا قافلہ

ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ حبشہ کے مہاجرین کا پہلا قافلہ دس افراد پر مشتمل تھا۔ ان کے نام بھی اس نے دیے ہیں۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ یہ کل گیارہ مرد اور چار خواتین تھیں[2]

بیہقی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مبارک سفر پر سب سے پہلے حضرت عثمانؓ اپنی اہلیہ حضرت رقیہؓ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی) کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تو آپ کو تشویش ہوئی۔ پھر قریش کی ایک عورت نے جو اس طرف سے آ رہی تھی آپ سے کہا کہ میں نے آپ کے داماد کو دیکھا کہ وہ اپنی بیوی کو ایک کم زور سے گدھے پر بٹھا کر خود اسے ہانکتے چلے جا رہے تھے۔ آپ نے دعا کی اللہ ان کے ساتھ ہو۔ فرمایا۔ حضرت لوطؑ کے بعد عثمان پہلے شخص ہیں جنھوں نے

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۵۸-۳۵۹

[2] اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ابن سعد نے جن اصحاب کے اسماء گرامی دیے ہیں ان میں ابوسبرہ اور ابوحاطب بن عمرو بن عبد شمس بھی ہیں لیکن ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ ابوسبرہ اس سفر میں تھے، ان کی جگہ ابوحاطب کا بھی نام لیا گیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق بنو عامر سے تھا۔ اس طرح ابن اسحٰق نے دونوں میں سے ایک کو شمار کیا ہے اور ابن سعد نے دونوں کو اس فہرست میں رکھا ہے۔ اسی طرح ابن ہشام نے خواتین کا الگ سے تذکرہ نہیں کیا ہے بلکہ جن مردوں کے ساتھ ان کا سفر ہوا تھا ان کے ذیل میں ان کا ذکر کر دیا ہے۔ ابن سعد نے ان کا الگ سے شمار کیا ہے۔ ابن ہشام، ۱/۳۵۹-۳۶۰؛ ابن سعد، طبقات: ۱/۲۰۴۔ نیز ملاحظہ ہو۔ ابن جریر طبری، تاریخ الطبری: ۱/۵۴۶۔

اپنی بیوی کے ساتھ خدا کی راہ میں ہجرت کی ہے۔[1]

اس سفر پر لوگ خاموشی سے (غالباً یکے بعد دیگرے) نکلے تاکہ کسی کو خبر نہ ہو۔[2] ان میں سے بعض تنہا تھے، بعض کے ساتھ ان کی بیویاں تھیں۔ زیادہ تر پیدل تھے۔ شُعَیبہ[3] کے پاس پہونچے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس وقت تاجروں کی دو کشتیاں لنگر انداز ہوئیں۔ نصف دینار کرایہ طے کرکے یہ ان میں سوار ہو گئے۔ قریش کو ان کے سفر کی اطلاع ملی تو انھوں نے اپنے آدمیوں کو دوڑایا، لیکن کشتیاں روانہ ہو چکی تھیں۔[4]

اس کے بعد حضرت جعفرؓ اور دوسرے اصحاب نے ہجرت کی۔ حبشہ ہجرت کرنے والوں کی کل تعداد ابن اسحٰق نے تراسی[5] بتائی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس تعداد میں عمار بن یاسرؓ بھی شامل ہیں لیکن ان کے بارے میں شبہ ہے کہ انھوں نے حبشہ ہجرت کی تھی یا نہیں؟ اس میں کم سن اور گود کے بچوں کا اور ان بچوں کا جو حبشہ میں پیدا ہوئے شمار نہیں کیا گیا ہے۔[6]

ان کے علاوہ خواتین تھیں جن کی تعداد اٹھارہ بتائی جاتی ہے۔[7]

---

[1] ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/۴-۵۔ ذہبی، السیرۃ النبویۃ: ۱/۱۸۳۔ ابن حجر، فتح الباری: ۷/۵۸۴ ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ بعض حضرات کے بقول ابو حاطب سب سے پہلے حبشہ پہونچے تھے۔ اس سلسلے میں بعض اور اقوال بھی ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو زرقانی علی المواہب: ۱/۵۰۵۔ ہوسکتا ہے حضرت عثمانؓ کو اپنی اہلیہ کے ساتھ سب سے پہلے ہجرت کا شرف حاصل ہوا ہو اور دوسرے اصحاب تنہا رہے ہوں۔ السیرۃ الحلبیہ: ۲/۳-۴۔

[2] یہ ایک عمومی بات ہے ورنہ حضرت عمرؓ کے اسلام کے ذیل میں ذکر آچکا ہے کہ عامر بن ربیعہؓ کی بیوی لیلیٰ نے انھیں بتایا کہ ہم لوگ تم لوگوں کے ظلم و زیادتی کی وجہ سے مکہ چھوڑ رہے ہیں۔ ان دونوں نے حبشہ ہجرت کی۔ غالباً یہ وہ افراد تھے جن کو اس بات کا خدشہ نہیں تھا کہ وہ سفر سے روک دیے جائیں گے۔ ملاحظہ ہو: تحقیقات اسلامی جنوری۔ مارچ ۲۰۰۰ء ص ۱۶-۱۷۔

[3] شعیبہ ایک وادی کا نام ہے۔ یمن کے راستہ میں ساحل پر واقع ہے۔ زرقانی علی المواہب: ۱/۵۰۵

[4] ابن سعد، طبقات: ۱/۲۰۴

[5] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۶۷-۳۶۸

[6] ابن حجر، فتح الباری: ۷/۵۸۵۔ مورخین اور سیرت نگاروں کے درمیان یہ بحث رہی ہے کہ =

مہاجرین کی مکہ واپسی

حبشہ کی ہجرت پر تین ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ یہ بات مشہور ہوگئی کہ قریش کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف ختم ہوگیا ہے۔ وہ سب ایمان لے آئے ہیں۔

= حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، جن کا تعلق یمن سے تھا مہاجرین حبشہ میں ہیں یا نہیں؟ اس کا یہ پہلو اہم ہے کہ مکہ میں ظلم وزیادتی کی چکی چل رہی ہے اور مسلمان پس رہے ہیں اور ایک سعید روح یمن سے آکر اسلام قبول کر رہی ہے۔ ابن ہشام اور ابن سعد وغیرہ نے مہاجرین حبشہ کی جو فہرست دی ہے اس میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا نام بھی ہے۔ ہجرت حبشہ کی تفصیل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں بھی موجود ہے۔ یہ روایت مسند احمد کی ہے۔ اس میں بھی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا نام ہے۔ (مسند احمد: ۴۸/۲) علامہ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ روایت باعتبار سند بہت عمدہ ہے اور اس کا سیاق بھی اچھا ہے لیکن یہ بات کہ ابوموسیٰ اشعریؓ حبشہ کے مہاجرین میں تھے، صحیح نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی راوی نے درمیان میں داخل کردی ہے۔ (السیرۃ النبویۃ: ۱۱/۲) بخاری کی روایت ہے۔ خود حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خروج (مدینہ پہونچنے) کی اطلاع ملی۔ اس وقت ہم یمن میں تھے۔ چنانچہ ہم (پچاس سے زائد افراد) کشتی کے ذریعہ آپ سے ملاقات کے ارادہ سے روانہ ہوئے لیکن ہماری کشتی نے (بادِ مخالف کی وجہ سے) ہمیں حبشہ پہونچادیا۔ وہاں ہماری ملاقات حضرت جعفرؓ سے ہوئی۔ ہم ان کے ساتھ وہیں رہے۔ فتح خیبر کے بعد ہم لوگ مدینہ پہونچے۔ آپؐ نے فرمایا۔ تم لوگوں کے لیے دو ہجرتوں کا ثواب ہے۔ (بخاری، مناقب الانصار، باب ہجرۃ الحبشہ) حافظ ابن حجر نے ان دونوں طرح کی روایات میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ کہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا علم ہوا ہو اور وہ مکہ پہونچ کر اسلام لے آئے ہوں۔ آپ نے انھیں مکہ سے حبشہ چلے جانے کا مشورہ دیا ہو یمن حبشہ کے سامنے ہی پڑتا ہے اس لیے وہ اپنی قوم کے پاس چلے گئے ہوں۔ پھر جب مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مملکت قایم کردی تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ (جو پچاس کے قریب تھے) ہجرت کے ارادے سے نکلے ہوں لیکن ناموافق ہواؤں نے ان کی کشتی کو حبشہ پہونچا دیا ہو۔ یہاں ان کی ملاقات حضرت جعفر سے ہوئی ہوگی۔ ان سب کی مدینہ واپسی خیبر کے بعد ہوئی۔ فتح الباری: ۵۸۵/۷۔ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بعثت کے ابتدائی دور میں مکہ پہونچے اور اسلام لے آئے۔ پھر وہ یمن واپس ہوگئے۔

اس کی وجہ بعض روایات میں یہ بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی ایک بڑی مجلس میں تشریف فرما تھے۔ آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس وقت ایسی وحی نہ نازل ہو جس سے ان کی نفرت اور دوری میں اضافہ ہو۔ اسی اثنا میں سورۂ نجم نازل ہوئی۔ آپ نے اس کی تلاوت فرمائی۔ جب آپ ان آیات پر پہونچے:

أفرأيتم اللات والعزىٰ	اب ذرا بتاؤ، تم نے کبھی اِس لات
ومناة الثالثة الاخرىٰ	اور اُس عزیٰ اور تیسری ایک دیوی منات
	کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا ہے

تو شیطان نے آپ کی زبان پر دو اور جملے جاری کر دئے۔

تلك الغرانيق العلىٰ	یہ بہت اونچے سمندری پرندے ہیں
وان شفاعتهن لترتجىٰ	اور ان کی سفارش کے قبول ہونے کی
	ضرور توقع ہے۔

سورۂ نجم آیتِ سجدہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس کی تلاوت کے بعد آپ نے سجدہ کیا تو کفار بھی سجدہ میں گر پڑے۔ حتیٰ کہ ولید بن مغیرہ بھی جو آپ کا شدید مخالف تھا، کبرِ سنی کی وجہ سے زمین پر سجدہ نہیں کر پایا تو ہاتھ میں مٹی لی اور اس پر ماتھا ٹیک دیا۔ بعض نے غرورِ نفس کی وجہ سے بھی ہاتھ میں مٹی لی اور اس پر سجدہ کیا۔[۱]

تلاوت ختم ہونے کے بعد کفارِ قریش نے کہا کہ ہم بھی مانتے ہیں کہ اللہ ہی موت وحیات کا مالک ہے۔ وہی خالق ورازق ہے۔ ہمارے یہ معبود تو بس اس کے نزدیک سفارش کرنے والے ہیں۔ جب آپ نے ان کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیا تو ہمارا آپ سے اختلاف نہیں ہے۔

---

* رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد وہ وہاں سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ روانہ ہوئے لیکن ہوا کا رخ مختلف ہونے کی وجہ سے حبشہ پہونچ گئے۔ حضرت جعفرؓ نے انھیں وہیں روک لیا۔ انھوں نے حضرت جعفر ہی کے ساتھ فتح خیبر کے بعد مدینہ ہجرت کی۔ دونوں کی کشتیاں ایک ساتھ پہونچیں۔ حضرت ابو موسیٰؓ کے سفر کے لیے ملاحظہ ہو۔ الاستیعاب: ۴/ ۳۲۷۔ اسد الغابہ ۳/ ۳۶۴، ۳۶۶ نیز: ۶/ ۲۹۹-۳۰۰۔ ابن کثیر۔ السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۱۴

[۱] تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ السیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۷۔ ابن حجر۔ فتح الباری: ۹/ ۵۹۷-۵۹۸

شام کو حضرت جبرئیل تشریف لائے۔ آپ نے انہیں یہ سورت سنائی تو انھوں نے بتایا کہ یہ جملے وحی کا حصہ نہیں تھے۔ آپ کو بڑا صدمہ ہوا کہ شیطان کے اثر سے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔ اس پر قرآن شریف کی یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ	ہم نے آپ سے پہلے جس رسول اور
مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ	نبی کو بھی بھیجا اس کے ساتھ یہ واقعہ ضرور
اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ	پیش آیا ہے کہ اس نے تمنا کی تو شیطان
فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ	اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ پھر اللہ
مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ	شیطان کی خلل اندازیوں کو مٹا دیتا
اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ	ہے اور اپنی آیات کو محکم کر دیتا ہے۔ اللہ
حَكِيْمٌ ۝ (الحج: ۵۲)	علیم و حکیم ہے۔

اس آیت میں یہ اطمینان دلایا گیا کہ شیطان تو ہمیشہ خلل اندازی کرتا ہی رہا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ وحی کو اس سے پاک کر دیتا ہے آپ کو بھی اس سے محفوظ رکھے گا اور وحی میں کوئی خارجی آمیزش نہیں ہونے پائے گی۔

اسی اثنا میں حبشہ یہ خبر پہونچ گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے درمیان قرآن مجید کی تلاوت فرمائی اور وہ آپ کے ساتھ سجدہ میں گر پڑے تو انھوں نے سوچا کہ جب قریش اور آپ کے درمیان صلح ہو گئی ہے تو ہمیں مکہ واپس ہو جانا چاہیے تاکہ ہم اپنے وطن میں اپنے اپنے خاندان کے ساتھ رہ سکیں۔[1]

اس روایت کے سلسلہ میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب سے قطع نظر یہ اس ایمان و عقیدہ اور تاریخی حقیقت کے خلاف ہے کہ قرآن مجید کا لفظ لفظ محفوظ اور ہر طرح کے اختلاط سے محفوظ ہے۔ اس روایت پر سخت تنقید بھی کی گئی

---

[1] اس واقعہ کو ابن جریر طبری نے سورۂ حج کی مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں کئی سندوں سے نقل کیا ہے تفسیر طبری جزء ۱۷ ص ۱۳۱-۱۳۴ طبع قدیم۔ اپنی تاریخ میں بھی ان روایات کا خلاصہ نقل کر دیا ہے۔ تاریخ الامم والملوک: ۱/۵۵۰ - ۵۵۱۔ نیز ملاحظہ ہو۔ ابن سعد، طبقات: ۱/۲۰۵ - ۲۰۶۔ ذہبی، السیرۃ النبویۃ: ۱/۱۸۶-۱۸۷

ہے اور اس کی توجیہات بھی کی گئی ہیں[1] البتہ اتنی بات صحیح ہے کہ مشرکین کے اسلام لانے کی

[1] علامہ ابن کثیر کہتے ہیں قد ذکر کثیر من المفسرین ھٰھنا قصۃ الغرانیق وما کان من رجوع کثیر من المھاجرۃ الی ارض الحبشۃ ظنًّا منھم أن مشرکی قریش قد أسلموا، ولکن من طرقٍ کلّھا مرسلۃ، ولم ارھا مسندۃ من وجہ صحیح واللہ اعلم۔ تفسیر القرآن: ۲۲۹/۲ (بہت سے مفسرین نے اس جگہ (سورۂ حج کی آیت کے ذیل میں) قصۂ غرانیق کا ذکر کیا ہے اور یہ کہ حبشہ ہجرت کرنے والوں میں سے بیشتر نے یہ سوچ کر مکہ واپسی اختیار کی کہ قریش اسلام لے آئے ہیں۔ لیکن یہ ساری روایتیں جن سندوں سے آئی ہیں وہ سب مرسل ہیں۔ میرے علم کی حد تک یہ صحیح سند سے مروی نہیں ہیں) آگے چل کر اس سلسلہ کی بعض اور روایات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کلّھا مرسلات ومنقطعات ۲۳۰/۲۔ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے کیونکہ اس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ السیرۃ النبویۃ: ۵۶/۲

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس سلسلہ کی زیادہ تر روایتیں حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہیں۔ ان میں سے اکثر ضعیف یا منقطع ہیں، لیکن ان کے کثرتِ طرق سے معلوم ہوتا ہے کہ قصہ بے بنیاد نہیں ہے۔ پھر انھوں نے ان لوگوں پر تنقید کی ہے جنھوں نے اس سلسلہ کی تمام روایتوں کو ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے اس لیے کہ جو روایت کئی سندوں اور مختلف طریقوں سے آئی ہو اس کے بارے میں یہی سمجھا جائے گا کہ اس کی کوئی اصل ہے۔ پھر اس کے بعد اس واقعہ کی جو توجیہات کی گئی ہیں انھیں نقل کیا ہے۔ (فتح الباری: ۳۶۸/۹ - ۳۶۹)۔

اس روایت کی مناسب توجیہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع میں سورۂ نجم تلاوت فرمائی تو مشرکین میں سے کسی نے درمیان میں دو جملوں کا اضافہ کر دیا اور بہت سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ جملے بھی آپ کی زبان سے ادا ہوئے ہیں یہی توجیہ حصاص وغیرہ نے کی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو زرقانی علی المواہب ۱۵/۲ - ۳۱۔ اس روایت پر قدیم علماء و محققین نے جو تنقید کی ہے اور اسے ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے، اسے سیرت ابن ہشام: ۴۰۲/۱ اور ذہبی کی السیرۃ النبویۃ ۱۸۶/۱ - ۱۸۷ کے محشّی اور تعلیق نگار حضرات نے بھی جمع کر دیا ہے۔

بخاری وغیرہ کی احادیث سے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ سورۂ نجم کے آخر میں آپ نے سجدہ کیا تو آپ کے ساتھ مسلمانوں نے بھی اور مشرکین نے بھی سجدہ کیا۔ (بخاری، کتاب التفسیر، سورہ والنجم، باب فاسجدوا للہ واعبدوا) اس کی وجہ قرآن شریف کا زورِ بیان، اس کی شوکتِ الفاظ اور اس کی تاثیر بھی ہو سکتی ہے۔ آپ نے اپنے پُرسوز اور پُرزور انداز میں جب اس کی تلاوت فرمائی ہوگی تو کوئی تعجب نہیں کہ آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ مشرکین بھی سجدہ میں گر پڑے ہوں۔

خبر حبشہ پہونچی اور ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ یہ لوگ مکے کے قریب پہنچے تو اطلاع ملی کہ خبر غلط تھی۔ اب ان میں سے جو بھی مکہ میں داخل ہوا وہ یا تو کسی کی پناہ میں داخل ہوا یا کسی خفیہ طریقہ سے پہنچا۔[1]

واقدی کا بیان ہے کہ جب حبشہ یہ خبر پہنچی کہ اہل مکہ نے سجدہ کیا ہے اور وہ سب اسلام لے آئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرتے دیکھ کر جب ولید بن مغیرہ اور ابواحیحہ جیسے مخالفین بھی سجدے میں گر پڑے تو مہاجرین نے سوچا کہ اب مکہ میں ان کا مخالف کون رہ گیا ہے؛ چنانچہ یہ مکہ واپس لوٹنے لگے۔ ابھی یہ مکہ پہنچنے ہی والے تھے کہ انھیں قبیلۂ کنانہ کے کچھ سوار ملے، انھوں نے ان سے قریش کا حال معلوم کیا تو انھوں نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قریش کے معبودوں کے حق میں کلمۂ خیر کہا تو سردارانِ قریش نے اُن کا ساتھ دیا پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے معبودوں کو بُرا بھلا کہنے (تنقید کرنے) لگے تو وہ بھی دوبارہ اُن کے خلاف ہو گئے اور شر کی روش اختیار کر لی۔ ہماری روانگی تک یہی صورتِ حال تھی۔[2]

یہ غلط فہمی کیسے ہوئی یا یہ افواہ کیسے پھیلی تو مورخین نے لکھا ہے کہ مشرکین نے سجدے کے واقعہ کو جس کسی نے نقل کیا اس نے جب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں مشرکین نے سجدہ کیا ہے تو اس نے سمجھا کہ وہ اسلام لے آئے ہیں اور آپ کے ساتھ ان کی صلح ہو گئی ہے اور کوئی نزاع باقی نہیں رہی۔

مہاجرینِ حبشہ کو جب یہ خبر پہنچی تو انھوں نے اسے صحیح سمجھ لیا، کچھ لوگ مکہ واپس ہو گئے اور کچھ لوگ وہیں رہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ دونوں گروہ اپنی جگہ صحیح تھے۔[3]

جو لوگ حبشہ سے مکہ واپس ہوئے ان کی تعداد تینتیس (۳۳) تھی۔ ابن ہشام نے فرداً فرداً اُن کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اُن میں سے کس کا کس قبیلہ سے تعلق تھا۔[4]

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۴۰۲

[2] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۰۶، حلبی، السیرۃ الحلبیہ: ۲/۲۶

[3] ابن کثیر، السیرۃ النبویہ: ۲/۵۷، نیز ملاحظہ ہو حلبی، السیرۃ الحلبیہ: ۲/۹

[4] ابن ہشام، السیرۃ النبویہ: ۱/۴۰۷۔ یہی بات اور مورخین نے بھی نقل کی ہے۔ طبری، تاریخ الامم والملوک: ۱/۵۵۲، ابن کثیر، السیرۃ النبویہ: ۲/۵۸، حلبی۔ السیرۃ الحلبیہ ۲/۹

ان حضرات کی حبشہ روانگی بعثت کے پانچویں سال ماہِ شعبان میں ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوتِ قرآن کا واقعہ رمضان میں پیش آیا مہاجرین حبشہ کی واپسی شوال میں ہوئی۔[۱]

دوبارہ حبشہ کی ہجرت

حبشہ سے جو اصحاب مکہ واپس ہوئے قریش نے ان کے ساتھ پہلے سے زیادہ سختی شروع کر دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دوبارہ حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔[۲]

جو اصحاب حبشہ سے واپس ہوئے اُن میں سے بیشتر پھر حبشہ روانہ ہو گئے اُن کے ساتھ کچھ نئے اصحاب بھی تھے۔[۳]

---

[۱] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۰۶، ابن اثیر، التاریخ الکامل: ۱/۵۹۶، حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۲/۵

[۲] سیرت حلبیہ میں ہے کہ حبشہ کی دوبارہ ہجرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شعبِ ابی طالب میں محصور ہونے کے بعد شروع ہوئی (السیرۃ الحلبیہ: ۲/۹) مزید لکھتے ہیں بعثت کے نویں سال محرم میں بنو ہاشم شعبِ ابی طالب میں محصور ہوئے، اس وقت جو مسلمان مکہ میں رہ رہے تھے انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا (السیرۃ الحلبیہ: ۲/۲۶) لیکن واقدی کا بیان ہے کہ جو اصحاب حبشہ سے مکہ واپس ہوئے اُن کے قبائل ان پر ٹوٹ پڑے اور ان کو سخت قسم کی اذیتیں دینے لگے، تو انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ حبشہ ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔ (ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۰۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ ہجرت پہلی ہجرت سے واپسی کے فوراً بعد شروع ہو گئی۔ علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ واقدی کے بیان کے مطابق دوبارہ ہجرت بعثت کے پانچویں سال کا واقعہ ہے (السیرۃ النبویہ: ۱/۱۹۱) یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ مکہ کی صورتِ حال دیکھنے کے بعد دوبارہ جلد ہی حبشہ روانگی شروع ہو گئی ہوگی۔

[۳] واقدی کا بیان ہے کہ اس بار ہجرت کرنے والوں میں مردوں کی کُل تعداد تراسی (۸۳) تھی، عورتوں میں گیارہ قریشی اور سات غیر قریشی تھیں (ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۰۷) اس طرح حبشہ ہجرت کرنے والے کُل ۱۰۲ افراد تھے۔ (زرقانی، شرح المواہب اللدنیۃ: ۲/۳۱-۳۲) یہی بات حلبی نے بھی کہی ہے (السیرۃ الحلبیہ: ۲/۲۷) ابن ہشام کے حوالے سے یہ بات گذر چکی ہے کہ حبشہ ہجرت کرنے والوں میں مردوں کی کل تعداد =

مہاجرین حبشہ جن حالات سے گزرے اس کی روداد ہمیں حضرت ام سلمہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی روایتوں میں ملتی ہے[1]۔

یہ وہ اصحاب ہیں جن کا براہِ راست اس ہجرت سے تعلق تھا۔ پہلے تین اصحاب مہاجرین حبشہ میں سے ہیں اور حضرت عمرو بن العاص مشرکین کی طرف سے سفیر کی حیثیت سے

= تراسی (۸۳) تھی لیکن ان بیانات سے یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہے کہ پہلی مرتبہ حبشہ کتنے افراد نے ہجرت کی تھی اور دوسری مرتبہ ہجرت کرنے والے کتنے افراد تھے۔ ابن ہشام ہی کے حوالے سے یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ پہلی ہجرت کے بعد مکہ واپس ہونے والوں کی تعداد تینتیس (۳۳) تھی۔ ابن کثیر کے بقول یہ کل نہیں تھے کچھ افراد حبشہ ہی میں مقیم رہے اور کچھ مکہ واپس ہوئے۔

واقدی کا بیان ہے" فلما سمعوا بمهاجرة رسول الله صلى الله عليه وسلم رجع منهم ثلاثة وثلاثون رجلا ومن النساء ثماني نسوة فمات منهم رجلان بمكة وحبس بمكة سبعة نفر لم شهدا بدرا منهم اربعة وعشرون رجلاً" (ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۰۷، طبری، تاریخ الامم: ۱/۵۵۲)

یعنی یہ تینتیس مرد اور آٹھ خواتین ہجرتِ مدینہ کے بعد مکہ واپس آئے۔ اُن میں سے دو کا مکہ ہی میں انتقال ہوگیا اور سات کو مکہ والوں نے مدینہ ہجرت کرنے نہیں دیا۔ جو بیس نے مدینہ ہجرت کی اور جنگِ بدر میں شریک ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تعداد کا حبشہ کی پہلی ہجرت کے بعد واپسی سے تعلق نہیں ہے بلکہ یہ ہجرتِ مدینہ کے بعد کا واقعہ ہے۔

اس طرح مؤرخین کے نزدیک حبشہ ہجرت کرنے والوں اور واپس ہونے والوں کی تعداد متعین ہے لیکن کس ترتیب سے یہ واقعہ پیش آیا واضح نہیں ہے۔ تمام تفصیلات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ہجرتِ حبشہ کے بعد کچھ لوگ مکہ واپس ہوئے۔ مکہ کی صورتِ حال دیکھنے کے بعد اُن میں سے بیشتر نے دوبارہ ہجرت کی اور بعض افراد مکہ ہی میں رہ گئے، کچھ نئے افراد بھی دوسری ہجرت میں روانہ ہوئے بنو ہاشم کے شعبِ ابو طالب میں محصور ہونے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد ہجرتِ مدینہ کا واقعہ پیش آیا۔ کچھ لوگ براہِ راست مدینہ منورہ پہنچے اور کچھ نے مکہ کا راستہ اختیار کیا۔ مکہ والوں نے بعض کو مدینہ ہجرت کرنے نہیں دیا۔ زیادہ تر نے مدینہ ہجرت کی اور جنگِ بدر میں شریک ہوئے۔

[1] حضرت ام سلمہؓ کی روایت کے لیے ملاحظہ ہو ابن ہشام، السیرۃ النبویہ: ۱/۳۷۲-۳۷۳، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت مسند احمد: ۲/۴۸۰ میں ہے۔ حضرت جعفرؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی روایات ابن عساکر نے عمدہ سند کے ساتھ نقل کی ہیں۔ اُن تمام روایتوں کو ابن کثیر نے جمع کر دیا ہے۔ السیرۃ النبویۃ ۲/۱۴، اور آگے کے صفحات۔

نجاشی کے پاس گئے تھے۔

حبشہ ان مہاجرین کے لیے اچھی پناہ گاہ ثابت ہوا اور وہ وہاں اطمینان اور سکون سے رہنے لگے۔ حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب حبشہ پہنچے تو ہمارے ساتھ نجاشی کا سلوک بہت اچھا رہا، وہ ہمارے لیے بہترین پڑوسی تھے۔ دین کے معاملے میں ہم محفوظ و مامون ہو گئے۔ کوئی ہمیں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچاتا تھا اور کوئی ناپسندیدہ بات ہمیں سننی نہیں پڑتی تھی۔

قریش کے علم میں جب یہ بات آئی تو ان کی عصبیتِ جاہلیہ بھڑک اٹھی انھوں نے مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے؟ طے پایا کہ نجاشی کے پاس سفیر بھیج کر درخواست کی جائے کہ وہ ان لوگوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کرے اور ہمارے حوالے کر دے۔ سفارت کے لیے دو خوب مضبوط اور توانا افراد کا انتخاب کیا جائے۔ نجاشی کو مکہ کی سب سے قیمتی چیزیں بطور تحفہ بھیجی جائیں۔ اس کے ایک ایک مذہبی رہنما کے لیے بھی تحائف کا انتظام کیا جائے۔ اہلِ حبشہ کو یہاں کے چمڑے بہت پسند تھے۔ عمدہ چمڑے جمع کیے گئے۔ اس کے ساتھ نجاشی کے لیے ایک گھوڑا اور ریشمی عبا (کرتا) بھی تھی۔ حبشہ کے مذہبی رہنماؤں کے لیے بھی تحفوں کا انتظام کیا گیا۔ ان تحائف کے ساتھ عبداللہ بن ابو ربیعہ اور عمرو بن العاص کو سفارتی مہم پر روانہ کیا گیا۔[1] ان سفراء کو ہدایت کی گئی کہ نجاشی سے بات کرنے سے پہلے ہر مذہبی رہنما کو اس کا تحفہ پہنچا دیں۔ آخر میں نجاشی کی خدمت میں تحفے پیش کیے جائیں اور اس سے بات کی جائے۔ ان سفیروں نے حسبِ فیصلہ عمل کیا، ہر سردار تک اس کا تحفہ پہنچایا اور اس سے کہا کہ ہمارے کچھ ناسمجھ نوجوان بادشاہ کی مملکت میں بھاگ آئے ہیں، اپنا دین چھوڑ دیا ہے، آپ کا دین (عیسائیت) بھی نہیں قبول کیا ہے، بلکہ ایک نیا ہی دین ایجاد کر رکھا ہے جس سے نہ ہم واقف ہیں نہ آپ حضرات۔ ہمارے اشراف

---

[1] بعض روایات میں عبداللہ بن ربیعہ کی جگہ عمارہ بن ولید کا ذکر ہے اور اس سفر میں دونوں کے کردار سے متعلق بعض تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ قریش نے دو مرتبہ سفارتی کوشش کی تھی۔ پہلے سفر میں عمرو بن العاص کے ساتھ عمارہ بن ولید تھا اور دوسرے میں عمرو بن العاص کے ساتھ عبداللہ بن ابی ربیعہ تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حلبی۔ السیرۃ الحلبیہ: ۲/۳۲-۳۴

اور سرداروں نے ہمیں بادشاہ کی خدمت میں بھیجا ہے تاکہ وہ انہیں واپس کر دیں۔ جب بادشاہ سے ہماری بات ہو تو آپ حضرات بادشاہ کو مشورہ دیں کہ وہ انھیں ہمارے حوالے کر دیں اور اُن سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کریں، اس لیے کہ اُن کے سردار اور ان کے بزرگ ان کے حالات سے زیادہ باخبر ہیں۔ ان پر دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ حبشہ کے مذہبی سرداروں نے اس سے اتفاق کیا۔

اب دونوں سفیروں نے براہِ راست نجاشی سے ملاقات کی اور تحفے تحائف پیش کیے۔ نجاشی نے تحفے قبول کیے۔ اپنی نشست کے دائیں بائیں دونوں سفیروں کو جگہ دی۔ آمد کا مقصد دریافت کیا۔ انھوں نے وہی باتیں دہرائیں جو کہ پادریوں سے کی تھیں کہ ہمارے کچھ ناسمجھ نوجوان آپ کی مملکت میں بھاگ آئے ہیں، اپنی قوم کے دین کو ترک کر دیا ہے اور آپ کے دین کو بھی قبول نہیں کیا ہے۔ ایک نیا ہی دین اختیار کر رکھا ہے۔ ان کی قوم کے سرداروں نے، اُن کے خاندانوں کے بزرگوں نے، ان کے باپوں اور چچاؤں نے، ان کا جن قبائل سے تعلق ہے، ان کے نمایاں افراد نے ہمیں آپ کی خدمت میں بھیجا ہے تاکہ آپ انھیں ان کے وطن لوٹا دیں۔ سفیروں نے نجاشی کو بھی یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس مسئلہ میں وہ ان مہاجرین سے کوئی بات نہ کرے، اس لیے کہ ان کی قوم ان کے غلط فکر و عمل سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ واقف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں سفیروں کو یہ سخت ناگوار تھا کہ نجاشی سے مہاجرین کی گفتگو ہو۔ انھیں اندیشہ تھا کہ اس سے نجاشی متاثر ہو سکتا ہے۔ مجلس میں جو سردار اور مذہبی رہنما موجود تھے انھوں نے بھی سفیروں کے اس خیال کی تائید کی کہ مہاجرین سے گفتگو کی چنداں حاجت نہیں ہے۔ نجاشی نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور کہا قسم خدا کی میں تحقیقِ حال کے بغیر انھیں اس طرح ان کے حوالے نہیں کروں گا۔ یہ بات سراسر ناانصافی کی ہوگی کہ کچھ لوگوں نے میری ہم سائیگی اختیار کی، میرے ملک میں آئے، دوسروں کے مقابلے مجھے پسند کیا، میں ان سے بات چیت کیے بغیر ہی انھیں نکال باہر کروں۔ میں اُن سے معلومات کروں گا۔ اگر سفیروں کی بات درست نکلے تو انھیں ان کے حوالے کر دوں گا اور انھیں ان کی قوم کے پاس پہنچا دوں گا، لیکن اگر بات دوسری ہو تو میں انھیں ان سفیروں کے حوالے نہیں کروں گا۔ جب تک وہ میرے پاس ہیں ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا۔

مہاجرین سے گفتگو سے پہلے اُس نے مذہبی رہنماؤں (نصاریٰ کے علماء و پادریوں) کو طلب کیا، وہ حاضر ہوئے تو اُن سے کہا کہ وہ اپنے صحیفے کھول لیں (غالباً اس خیال سے کہ دیکھیں ان مہاجرین کی باتوں کی ان صحیفوں سے تصدیق ہوتی ہے یا نہیں؟)

اب اس نے مہاجرین کو طلب کیا۔ قاصد اُن کے پاس پہنچا تو انھوں نے باہم مشورے سے طے کیا کہ بادشاہ کے سامنے وہی بات رکھی جائے جس کی تعلیم ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ حضرت جعفر نے کہا نجاشی کے سامنے میں تم سب کی نمائندگی کروں گا۔ سب نے اس سے اتفاق کیا۔

مہاجرین روانہ ہوئے۔ دربار میں پہنچنے سے پہلے حضرت جعفر نے باہر سے آواز دی کہ جعفر دروازے پر ہے۔ اس کے ساتھ حزب اللہ ہے، کیا حاضری کی اجازت ہے؟ نجاشی نے کہا ہاں، تمہیں اللہ کی امان اور اس کی پناہ حاصل ہے، اندر آ سکتے ہو۔ حضرت جعفرؓ داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے ان کے رفقاء تھے، سلام کیا۔ دربار میں جو علماء اور راہب موجود تھے، انھوں نے ان سے کہا کہ بادشاہ کو سجدہ کرو۔ حضرت جعفر نے انکار کر دیا[1]

حضرت عمرو بن العاص نے کہا کہ یہ بڑے متکبر اور رنخوت بھرے لوگ ہیں۔ خود کو حزب اللہ کہتے ہیں۔ جس طرح دوسرے لوگ آپ کی تعظیم بجالاتے ہیں اس طرح انھوں نے تعظیم نہیں کی اور سجدۂ تعظیمی نہیں کیا۔ نجاشی نے اُن سے اس کی وجہ دریافت کی تو حضرت جعفرؓ نے کہا کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں، اس کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ ہمارے پیغمبر نے ہمیں بتایا ہے کہ اہلِ جنت آپس میں سلام کریں گے۔ ہم بھی ایک دوسرے کو سلام ہی کرتے ہیں۔ چونکہ انجیل میں یہ بات موجود ہے، اس لیے نجاشی سمجھ گیا کہ یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں[2]

نجاشی اور حضرت جعفرؓ کے درمیان حسبِ ذیل گفتگو ہوئی۔

نجاشی: تمہارا دین کیا ہے؟ کیا تم نصاریٰ ہو؟

حضرت جعفر: نہیں۔

---

[1] ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱۲/۲

[2] حلبی، السیرۃ الحلبیہ: ۲۸/۲

نجاشی: کیا تم یہود ہو؟
حضرت جعفر: نہیں۔ ہم یہود نہیں ہیں۔
نجاشی: کیا تمہارا دین وہی ہے جو تمہاری قوم کا ہے؟
حضرت جعفر: نہیں۔
نجاشی: آخر تمہارا دین کیا ہے اور اس کا لانے والا کون ہے؟
اس پر حضرت جعفرؓ نے ایک طویل تقریر کی۔
اے بادشاہ! ہم ایسے لوگ تھے جو جاہلیت میں گرفتار تھے۔ بتوں کی پرستش کرتے تھے، بے حیائی کے کاموں میں ملوث تھے۔ قطع رحم کا ارتکاب کرتے تھے، رشتوں کے حقوق نہیں ادا کرتے تھے، پڑوسیوں کے ساتھ برا سلوک کرتے تھے، ہم میں جو قوی تھا وہ کم زور کو کھائے جا رہا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ہم ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا۔ ان کے حسب نسب، صداقت، امانت، عفّت و عصمت سے ہم واقف تھے۔ انھوں نے ہمیں اللہ کی طرف دعوت دی کہ ہم اسے ایک مانیں، اسی کی عبادت کریں۔ ہمارے باپ دادا اللہ کو چھوڑ کر پتوں کی اور پتھروں کی جو پوجا پرستش کرتے ہیں اسے ترک کر دیں۔ انھوں نے ہمیں راست گفتاری، امانت کی ادائیگی، صلۂ رحمی اور پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی۔ حرام چیزوں سے رک جانے کا حکم دیا، قتل و خوں ریزی سے، فواحش اور منکرات سے، دروغ گوئی سے، یتیم کا مال کھانے سے اور پاک باز عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا، نماز، زکوٰۃ (صدقہ و خیرات) اور روزے کا حکم دیا۔
حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت جعفرؓ نے اس طرح اسلام کی بہت سی تعلیمات کی وضاحت کی۔ اس کے بعد کہا: ہم نے اللہ کے رسول کی ان باتوں کی تصدیق کی، آپؐ پر ایمان لے آئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ جو تعلیمات لائے ہیں انھیں ہم برحق مانتے ہیں۔ اللہ واحد کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔ اللہ کے رسول نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، انھیں حرام اور جن چیزوں کو حلال کہا انھیں حلال سمجھ کر عمل کرتے ہیں۔
اس پر ہماری قوم نے ہمارے ساتھ ظلم و زیادتی کی روش اختیار کر رکھی ہے۔ اس

نے ہمیں سخت سزائیں دیں، ہمیں اپنے دین سے پھیرنے کی کوشش کی تاکہ ہمیں اللہ واحد کی عبادت سے پھیر کر بت پرستی کی طرف لے جائیں۔ ہم جن خبیث حرکتوں کا ارتکاب کرتے تھے پھر ان کا ارتکاب کرنے لگیں۔ جب انھوں نے ہم پر قہر و غضب ڈھایا، ظلم کیا، زندگی ہمارے لیے تنگ کر دی، ہمارے اور ہمارے دین کے درمیان رکاوٹ بن کر کھڑے ہو گئے، تو ہم نے دوسروں کے مقابلہ میں آپ کے ملک کو ترجیح دی، آپ کے جوار میں رہنا پسند کیا، اس توقع پر کہ آپ کے ہاں، اے بادشاہ! ہم پر ظلم نہ ہوگا اور ہم زیادتیوں سے محفوظ رہیں گے۔

یہ بے نظیر اور دل ہلا دینے والی تقریر سننے کے بعد نجاشی نے حضرت جعفرؓ سے دریافت کیا کہ تمہارے پیغمبر جو کلام خدا کی طرف سے پیش کرتے ہیں کیا اس کا کوئی حصہ تمہارے پاس ہے؟ حضرت جعفرؓ نے کہا ہاں! نجاشی نے کہا۔ وہ مجھے سناؤ۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کا ابتدائی حصہ پڑھا۔ نجاشی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس کی داڑھی تر ہو گئی۔ جو علما، دربار میں موجود تھے ان کی آنکھیں بھی اشک بار ہو گئیں۔ ایک روایت میں ہے کہ نجاشی نے مزید کچھ سنانے کی درخواست کی تو حضرت جعفرؓ نے سورۂ کہف سنائی۔ نجاشی نے کہا۔ یہ کلام اور حضرت عیسیٰؑ جو کلام لائے تھے دونوں ایک ہی چراغ سے نکلے ہیں۔ پھر عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص سے کہا۔ آپ لوگ یہاں سے جائیں۔ میں انہیں تمہارے حوالہ نہیں کروں گا۔[1]

عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ دربار سے باہر نکلے تو عمرو بن عاص نے کہا کل ایک ایسی بات میں بادشاہ سے کہوں گا کہ وہ انھیں جڑ بیڑ سے اکھاڑ پھینکے گا۔ ان دونوں میں عبداللہ بن ربیعہ نسبتاً نرم تھے۔ انھوں نے کہا۔ ایسی کوئی بات نہ کرو۔ یہ لوگ چاہے ہمارے دین کے خلاف ہوں لیکن ان سے ہمارا خونی رشتہ ہے۔ عمرو بن عاص اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ چنانچہ وہ دوسرے دن بادشاہ کے پاس پہونچے اور کہا۔ اے بادشاہ! یہ لوگ عیسیٰ بن مریم کے بارے میں بہت سخت بات کہتے ہیں۔ آپ ان سے

---

[1] حضرت جعفرؓ کی تقریر اور واقعہ کی یہ تفصیل ابن ہشام نے بیان کی ہے۔ ۱/۳۷۳-۳۷۴۔ دیگر مورخین نے اسی سے نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۱/۵۹۹-۶۰۰۔ ذہبی نے تقریباً یہی تفصیل موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے بیان کی ہے السیرۃ النبویۃ: ۱/۱۸۸-۱۸۹

اس سلسلہ میں دریافت کریں۔ دوسرے دن اس نے پھر مہاجرین کو طلب کیا۔ حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ یہ ہمارے لیے بڑا نازک معاملہ تھا۔ لوگ جمع ہوئے اور مشورہ کیا کہ ہمیں اس سوال کا کیا جواب دینا چاہیے؟ پھر یہی طے پایا کہ ہم وہی کہیں گے جو اللہ اور اس کے رسول نے کہا ہے، چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ چنانچہ جب یہ لوگ دربار میں پہونچے تو نجاشی نے سوال کیا کہ تم لوگ عیسیٰ بن مریم کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ حضرت جعفرؓ نے جواب دیا۔ ہم ان کے بارے میں وہی کہتے ہیں جو ہمارے پیغمبر نے ہمیں خدا کی طرف سے بتایا ہے۔ وہ اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح اور کلمہ تھے جو مریم عذرا، بتول سے بغیر باپ کے اللہ کے کلمہ سے پیدا ہوئے۔

نجاشی نے حضرت جعفر کے اس بیان کو سننے کے بعد زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا عیسیٰ بن مریم اس بیان سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہ تھے[1]

بعض روایات میں اس کی کچھ اور تفصیل ملتی ہے۔ حضرت جعفرؓ کی گفتگو کے ختم ہونے پر نجاشی نے دربار میں موجود عالموں اور راہبوں سے دریافت کیا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اس پر تم کیا اضافہ کرنا چاہتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا۔ آپ ہی فرمائیں۔ آپ کا علمی مرتبہ اور مقام ہم سے اونچا ہے[2]

نجاشی نے کہا میں شہادت دیتا ہوں کہ حضرت محمدؐ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کی بشارت حضرت عیسیٰ نے انجیل میں دی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ نجاشی نے علماء اور راہبوں سے کہا کہ خدائے تعالیٰ جس نے عیسیٰ پر انجیل نازل کی میں اس کی قسم دے کر تم سے پوچھتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ کے بعد قیامت کے آنے سے پہلے کسی نبی کا ذکر تمہیں انجیل میں ملتا ہے یا نہیں؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں، ملتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس کی بشارت دی ہے اور کہا ہے کہ جو

---

[1] ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۷۰ - ۳۷۵

[2] نجاشی کے بارے میں آتا ہے۔ کان النجاشی اعلم النصاریٰ بما انزل علی عیسیٰ وکان قیصر یرسل الیہ علماء النصاریٰ لتاخذ عنہ حلبی، السیرۃ الحلبیہ: ۲/۲۹ (حضرت عیسیٰ پر جو تعلیمات نازل ہوئیں، نجاشی ان کے سب سے بڑے عالم تھے۔ قیصر روم ان کے پاس علماء نصاریٰ کو بھیجتا تھا تاکہ وہ ان سے علم حاصل کریں)

اس پر ایمان لاتا ہے وہ مجھ پر ایمان لاتا ہے اور جو اس کی رسالت کا انکار کرتا ہے وہ میرا انکار کرتا ہے۔ اس پر نجاشی نے کہا اگر سلطنت کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوتی تو میں بذاتِ خود اس کی جوتیاں اٹھاتا اور اس کے ہاتھ پیر دھلاتا۔[۱]

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نجاشی سے گفتگو کے دوران میں حضرت جعفرؓ نے نجاشی سے کہا کہ آپ ان سفیروں سے دریافت فرمائیں کہ ہم غلام ہیں یا آزاد؛ اگر غلام ہیں تو بے شک ہم نے اپنے مالکوں سے فرار کی راہ اختیار کی ہے۔ آپ ہمیں لوٹا دیں۔ عمرو بن عاص نے کہا نہیں! یہ آزاد لوگ ہیں۔ حضرت جعفر نے فرمایا ان سے پوچھیں کہ کیا ہم نے ناحق کسی کا خون بہایا ہے کہ ہم سے قصاص کا مطالبہ کر رہے ہوں؟ کیا ہم نے ناروا کسی کا مال لے رکھا ہے اور اس کا ادا کرنا ہم پر ضروری ہو گیا ہے؟ عمرو بن عاص نے جواب دیا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نجاشی نے سفیروں سے کہا آپ حضرات واپس جائیں۔ میں کبھی انھیں آپ کے حوالہ نہیں کروں گا۔[۲]

اس طرح نجاشی کو یقین ہو گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعتاً اللہ کے رسول ہیں۔ یہ مہاجرین ان کے اصحاب اور پیروکار ہیں۔ یہ کسی کے زر خرید غلام نہیں ہیں بلکہ آزاد بندے ہیں۔ انھوں نے کسی کا حق نہیں مارا ہے، کسی کا مال نہیں کھایا ہے، بلکہ ان کے ساتھ سراسر زیادتی ہوئی ہے اور وہ یہاں پناہ کے طالب ہیں۔ اس یقین نے اس کے جذبۂ ہمدردی کو بڑھا دیا۔ اس نے مہاجرین سے کہا۔ جاؤ تم لوگ میری سلطنت میں مامون اور محفوظ ہو۔ جو کوئی تمہیں برا بھلا کہے گا اس پر جرمانہ عائد ہوگا۔ تم میں سے کسی کو تکلیف پہونچا کر مجھے سونے کا پہاڑ بھی مل جائے تو میں اسے پسند نہ کروں گا۔ درباریوں سے کہا ان سفیروں کے تحفے واپس کر دئے جائیں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بعد مہاجرین حبشہ میں سکون سے رہنے لگے۔[۳]

جرمانہ کے سلسلہ میں یہ تفصیل ملتی ہے کہ نجاشی نے مہاجرین سے پوچھا کہ کیا کوئی

---

[۱] حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۲/۲۹

[۲] حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۲/۳۲۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/۱۵

[۳] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۷۰

تمہیں تکلیف پہونچاتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا۔ ہاں! (قریش کے سفیروں کے ورغلانے سے ہوسکتا ہے کچھ لوگوں نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہو) اس پر نجاشی کے حکم سے منادی نے اعلان کیا کہ جو کوئی انھیں تکلیف پہونچائے گا اس پر چار دینار جرمانہ ہوگا۔ مہاجرین سے دریافت کیا کہ کیا یہ کافی ہے؟ انھوں نے اسے ناکافی بتایا تو نجاشی نے اسے دوگنا کر دیا۔[1]

نجاشی نے بڑے نازک وقت میں مسلمانوں کو پناہ دی تھی۔ انھیں سکون اور اطمینان کے ساتھ دین پر عمل کے مواقع حاصل تھے۔ اس لیے اس کی سلطنت اور اقتدار کا باقی رہنا ان کے لیے فائدہ مند تھا۔ اس کے زوال اور خاتمہ سے انھیں نقصان کا خطرہ تھا۔ چنانچہ اسی ہجرت کے دوران میں نجاشی کا ایک حریف سلطنت اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں کے درمیان جنگ کی نوبت آگئی۔ اس موقع پر مسلمانوں کی فطری خواہش تھی کہ نجاشی اس میں کامیاب ہو اور اس کا اقتدار قائم رہے۔ کوئی ایسا شخص ملک پر قابض نہ ہو جائے جس کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ اس کا کیا رویہ ہوگا؟ اس کی تفصیل حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں۔ فرماتی ہیں۔

ہم نجاشی کی سلطنت میں امن وسکون کے ساتھ رہ رہے تھے کہ اسی اثناء میں ایک شخص سلطنت کا دعویدار بن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ قسم خدا کی اس وقت جیسا غم وحزن ہم پر طاری رہا اس طرح کا غم وحزن میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ نجاشی ہمارے حقوق پہچان رہا تھا۔ ڈر تھا کہ اس کا حریف غالب آجائے اور وہ جو حقوق ہمیں حاصل ہیں انھیں پامال کردے۔ نجاشی اپنے حریف کے مقابلہ کے لیے نیل کے پار پہونچا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے آپس میں کہا کہ ہم میں سے کون شخص ہے جو میدانِ جنگ تک پہونچ کر صورت حال سے ہمیں آگاہ کرے۔ حضرت زبیر بن عوامؓ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ سب سے کم سن تھے اس لیے حیرت کا اظہار کیا گیا۔ لیکن بہرحال ان کے لیے تیرنے کا سامان فراہم کیا گیا اور وہ دریائے نیل پار کر کے میدانِ جنگ تک پہونچے۔ ہم لوگ دعا کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نجاشی کو دشمن پر غلبہ عطا کرے اور ملک پر اس کا اقتدار قائم رہے۔ اب ہم نتیجہ

---

[1] ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ: ۱۶/۲۔ حلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۲۹/۲

کا انتظار کرنے لگے کہ حضرت زبیر دوڑتے ہوئے نمودار ہوئے اور دور ہی سے کپڑا لہرا کر بتایا کہ خوش ہو جاؤ، نجاشی کامیاب ہو گیا ہے اور اللہ نے اس کے دشمن کو ہلاک کر دیا ہے۔ ملک پر اس کا اقتدار مستحکم ہو گیا ہے۔ فرماتی ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ کبھی ہم اتنے خوش ہوئے ہوں (غالباً مراد ہجرتِ حبشہ کے دوران) جتنے اس وقت خوش ہوئے۔ ہم حبشہ ہی میں رہے یہاں تک کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مکہ واپس پہونچے[1] (پہلی ہجرتِ حبشہ کا ذکر ہے)

جنگِ خیبر ۶ھ کے آخر میں یا بقول ابن اسحاق محرم ۷ھ میں ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیہ ضمریؓ کو نجاشی کے پاس بھیجا کہ جو اصحاب حبشہ میں رہ گئے ہیں انھیں مدینہ بھیج دے۔ نجاشی نے دو کشتیوں میں انھیں روانہ کیا۔ یہ حضرات فتح خیبر کے دن پہونچے۔ ان میں حضرت جعفرؓ بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے چمٹ گئے اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ فرمایا مجھے نہیں معلوم کہ آج فتح خیبر کی زیادہ خوشی ہے یا جعفر کی آمد کی؟ اس قافلہ میں سولہ[2] آدمی تھے۔ بعض کے ساتھ ان کی بیویاں اور چھوٹے بچے بھی تھے[3]

ہجرتِ حبشہ کی جو تفصیل اوپر بیان ہوئی ہے اس سے بعض اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔

۱۔ حبشہ ہجرت کرنے کی صحابۂ کرام کو اس وقت اجازت دی گئی جب کہ مکہ کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہو گئی، دین پر قائم رہنا دشوار سے دشوار تر ہو گیا اور دعوت کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جس ملک میں رہتے ہوں، وہاں دین پر عمل کی اگر آزادی ہے، دعوت کے مواقع حاصل ہیں اور اس کی راہیں کھلی ہیں تو اس ملک کو چھوڑنے یا ان سے ہجرت کا جواز ان کے لیے نہیں ہے۔ ان کی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ وہیں قیام کریں اور دین پر عمل کرتے ہوئے اس کی دعوت و تبلیغ اور سربلندی کی جدوجہد جاری رکھیں۔ (تلاشِ معاش یا کسی دنیوی غرض سے کسی ایک ملک سے

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۷۵-۳۷۶۔ ابن اثیر، تاریخ الکامل: ۱/۶۰۰۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/۳۳

[2] مہاجرینِ حبشہ میں سے جو افراد بدر میں شریک نہیں ہو سکے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامِ مکہ کے زمانہ میں مکہ واپس نہیں آئے اور ہجرتِ مدینہ کے بعد مدینہ پہونچے ان کی تعداد ابن اسحاق نے ان سولہ کے علاوہ چونتیس ۳۴ بتائی ہے۔ خواتین خالص عرب کی ۱۳ اور باہر کی ۵ تھیں۔ پوری تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن ہشام، ۴/۵، ۱۵۰

دوسرے ملک میں منتقل ہونا یا رہائش اختیار کرلینا ہجرت نہیں ہے)

۲۔ ہجرت کرنے والوں نے انتہائی بے بسی اور مجبوری کی حالت میں اپنا وطن چھوڑا، گھر بار چھوڑا اور اپنے خویش واقارب سے قطع تعلق کیا اور اجنبیت کی زندگی اختیار کی۔ کوئی تن تنہا تھا، کوئی جوان بیوی اور ننھے اور معصوم بچہ کے ساتھ تھا، کسی کے پاس سواری تھی، زیادہ تر پیدل تھے، تن بہ تقدیر ایک نامعلوم مستقبل کی طرف چل پڑے۔ وہ قدم قدم پر اس بات کا ثبوت فراہم کرتے چلے جارہے تھے کہ اللہ کا دین ان کے لیے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دے سکتے ہیں۔ اسی جذبہ نے انھیں دنیا اور آخرت کی کامیابی سے ہم کنار کیا۔

۳۔ حبشہ ایک غیر اسلامی اور عیسائی سلطنت تھی لیکن وہاں مسلمانوں کو اسلامی عقیدے پر قائم رہنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی آزادی تھی تبلیغ کے مواقع بھی حاصل تھے۔ اس پہلو سے وہ مہاجرین کے لیے دارالامن بن گیا۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگر کسی ملک میں اسلام پر قائم رہنا سخت دشوار ہوجائے اور کوئی دارالاسلام، جہاں مسلمان ہجرت کرسکے، موجود نہ ہو تو وہ کسی غیر اسلامی ملک میں جہاں دین پر عمل اور اس کی دعوت وتبلیغ کی آزادی حاصل ہو، ہجرت کرسکتا ہے۔

۴۔ نجاشی کا ایک حریف، سلطنت کا دعویدار بن کر اس کے خلاف کھڑا ہوا۔ دونوں کے درمیان معرکہ آرائی کی نوبت آگئی، اس میں مسلمانوں کی ہمدردی نجاشی کے ساتھ تھی، اس لیے کہ نجاشی عدل وانصاف کا علمبردار تھا۔ ظلم وزیادتی کو صحیح نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے مملکت میں یہ اعلان کررکھا تھا کہ کسی شخص کو مسلمانوں پر دست درازی کی اجازت نہ ہوگی۔ ورنہ اس پر جرمانہ عائد ہوگا۔ اس طرح نجاشی نے ان کے دین اور ان کی جان، مال اور عزت وآبرو کے لیے تحفظ فراہم کیا تھا۔ اس کے حریف کے بارے میں یہ بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی تھی کہ وہ اسی طرح کا رویہ اختیار کرے گا۔ اس لیے مسلمانوں کی ہمدردی نجاشی کو حاصل تھی اور وہ اس کی کامیابی کے آرزومند تھے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو مسلمان کسی غیر اسلامی سلطنت میں رہتے ہیں انھیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کس فرد یا گروہ کا اقتدار اسلام کے لیے اور خود ان کے لیے بہتر اور مفید ثابت ہوگا۔ جو اقتدار بہتر ہو اس کے حق میں

ان کی ہمدردی ہونی چاہیے۔

۵۔ دعوت وتبلیغ کے معاملہ میں ہجرت حبشہ ایک نیا تجربہ تھا۔ مکے میں مشرکین سے سابقہ تھا۔ وہاں شرک کی نامعقولیت واضح کی جارہی تھی اور توحید کے دلائل دیے جارہے تھے۔ حبشہ میں مسلمان ایک نئی صورت حال سے دوچار تھے۔ اس عیسائی مملکت میں چاروں طرف عیسائیت کا چرچا تھا اور مسیحی عقائد زیر بحث تھے۔ ہجرت حبشہ سے پہلے مکہ ہی میں سورۂ مریم نازل ہوچکی تھی۔ جس میں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی صحیح حیثیت واضح کی جاچکی تھی۔ ان کی تعلیمات بھی تفصیل سے بیان ہوئی تھیں۔ سورۂ کہف میں ابن اللہ کے تصور کی تردید اور عیسائی تاریخ کے بعض واقعات، توحید کی دعوت اور اس پر استقامت کا ذکر تھا۔ اس طرح مہاجرین اس نئی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے پہلے سے علمی اور فکری طور پر تیار تھے۔ نجاشی کے دربار میں اس سے فائدہ اٹھایا اور اس کے مطالبہ پر قرآن کی تعلیمات قرآن ہی کے الفاظ میں پیش کیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس دور میں اور جس ماحول میں جو علمی وفکری سوالات ابھریں اسلام کی دعوت کے لیے ان کا جواب فراہم کرنا ضروری ہے، ورنہ اسلام کی حقانیت ثابت نہ کی جاسکے گی اور دعوت کا حق ادا نہ ہوگا۔

۶۔ نجاشی اپنے دربار میں اعیانِ سلطنت اور مذہبی رہنماؤں کے ساتھ موجود تھا وہ سب اسلام سے بے خبر اور عیسائیت کے ماننے والے اور اس کے علم بردار تھے۔ ان کے درمیان حضرت جعفرؓ نے ایمانی جرأت کا زبردست ثبوت دیا۔ اسلام کے عقائد، توحید، رسالت اور آخرت کے تصور اور اس کے اخلاقیات کی وضاحت کی اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اسلام کے عقیدے کو بے کم وکاست پیش کیا۔ اس طرح یہ ثابت کردیا کہ نازک سے نازک حالات میں بھی دین کی ترجمانی اور اس کی تعبیر و تشریح میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، حالات اور ماحول کے زیر اثر اسلام کی ناقص اور نامکمل ترجمانی کی اجازت نہیں ہے۔ ان حضرات کا عزم وحوصلہ اور ایمانی جذبہ قیامت تک داعیانِ دین کے لیے نمونہ ہے۔

۷۔ مکہ میں ایمانیات پر زور تھا۔ توحید، رسالت اور آخرت کی تفصیل تھی۔ ان کے حق میں دلائل تھے۔ ان کے ماننے یا نہ ماننے کے نتائج سے آگاہ کیا جارہا تھا۔

اللہ واحد کی عبادت واطاعت کی ترغیب وتاکید اور اس کی معصیت ونافرمانی پر تہدید تھی۔ احکام میں نماز اور انفاق اور خلق خدا کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر تھا، اعلیٰ اخلاق کی تعلیم تھی، کھانے پینے میں حرام وحلال کے بعض حدود واضح کئے گئے تھے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد احکام شریعت تفصیل سے نازل ہوئے۔ مہاجرینِ حبشہ کے بارے میں تاریخ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان میں سے کتنے احکام کا انھیں علم تھا اور کتنے احکام پر وہ عمل کر پا رہے تھے؛ بہت سے احکام وہ ہیں جن پر عمل ایک با اختیار اور آزاد ماحول ہی میں ہو سکتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان مہاجرین کو اس طرح کی کتنی آزادی حاصل تھی۔ اس معاملہ میں شریعت کا اصول یہ ہے کہ آدمی اپنی استطاعت کی حد تک ہی مکلّف ہے۔ جو حکم اس کے دائرہ استطاعت سے باہر ہے اس کا وہ مکلّف نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں اصولی بات یہ بیان ہوئی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا
لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ	ہے اور اچھے کام کیے ہیں۔ ہم ہر ایک کو اس
(الاعراف: ۴۲)[1]	کی استطاعت کے مطابق ہی ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

۸۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نجاشی اسلام لے آئے تھے۔ متعدد واقعات سے ان کا اسلام پر ایمان ویقین، اللہ اور اس کے رسول سے محبت اور مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کا ثبوت ملتا ہے۔ انھوں نے حضرت جعفر کی تقریر سننے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنے دربار میں کہا کہ یہی وہ آخری پیغمبر ہیں جن کی بشارت انجیل میں دی گئی ہے اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں آپ کی تعلیمات بالکل صحیح ہیں۔ آپ سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا مجھے موقع ہوتا تو میں آپ کی خدمت میں پہنچتا اور آپ کے پیر دھوتا، لیکن مملکت پر ان کا اتنا مضبوط کنٹرول نہیں تھا کہ وہ کھل کر اسلام کا اظہار کرتے۔ حبشہ کے عوام اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب وہاں کے لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ ان کا عقیدہ بدل گیا ہے تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ اس صورت حال کے پیش نظر نجاشی نے حضرت جعفرؓ اور اُن کے ساتھیوں کو اپنے پاس بلایا۔ ان کے لیے کشتیوں کا نظم کیا اور کہا کہ آپ حضرات ان کشتیوں پر سفر کے لیے

---

[1] اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو۔ امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب منہاج السنۃ النبویۃ: ۵/۱۱۰-۱۱۳

تیار رہیں۔ اگر مجھے شکست ہو جائے تو جہاں چاہیں چلے جائیں لیکن اگر مجھے فتح حاصل ہو تو حسبِ سابق یہیں قیام کریں۔ پھر ایک تحریر لکھی جس میں کلمۂ شہادت "اشہد ان لاالٰہ الا اللہ واشہد ان محمداً عبدہ ورسولہ" تھا اور یہ بھی تھا کہ نجاشی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم اللہ کے بندے، اس کے رسول اور اس کی روح تھے اور اس کا کلمہ تھے جسے اس نے مریم کے اندر پھونکا تھا۔ اس تحریر کو نجاشی نے اپنی قبا کے نیچے دائیں جانب رکھ چھوڑا۔ اس کے بعد حبشہ کے باغی گروہ کے پاس پہنچا۔ وہ اس کے مقابلہ کے لیے صف باندھے تیار تھے۔ اُن سے کہا۔ لوگو! کیا میں اس ملک پر حکومت کا سب سے زیادہ مستحق نہیں ہوں؟ لوگوں نے جواب دیا ہاں آپ ہی اس کے مستحق ہیں۔ نجاشی نے سوال کیا تم نے میرے اخلاق اور میری سیرت کیسی دیکھی؟ لوگوں نے جواب دیا آپ بہتر سیرت کے مالک ہیں، لیکن آپ نے ہمارا دین ترک کر دیا ہے اور یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بندے تھے۔ نجاشی نے ان سے سوال کیا کہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم انھیں ابن اللہ سمجھتے ہیں۔ اس پر نجاشی نے عبا کے اوپر سے سینے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ عیسیٰ ابن مریم اس سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ (نجاشی کی مراد اس تحریر سے تھی جو ان کی قبا کے نیچے تھی لیکن مجمع نے سمجھا کہ وہ ان کے خیال کی تائید کر رہے ہیں) وہ خوش اور مطمئن ہو گئے اور بغاوت ٹل گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی یہ بات پہنچی تھی[1]۔

اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ایک عام آدمی ہی نہیں، صاحبِ حیثیت اور با اقتدار فرد بھی ایسے حالات میں گھر سکتا ہے کہ وہ اپنے ایمان کا اعلان اور اظہار نہ کر سکے۔ شریعت پر نجاشی کس حد تک عمل کر رہے تھے، اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ شریعت پر کھل کر عمل کرنا شاید اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ اتنی بات طے ہے کہ وہ حج، ہجرت اور جہاد جیسے احکام پر عمل نہیں کر سکے اور اپنی مملکت میں اسلامی احکام بھی نافذ نہ کر سکے، لیکن اس کے باوجود کفر و شرک کے ماحول میں اسلام اور مسلمانوں سے ان کی ہمدردی جاری رہی۔ مہاجرین کو اپنے ہاں جگہ دی۔ ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا۔ ان کی

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۷۸-۳۷۹۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویہ: ۲/۲۸، ۲۹

ہر طرح حفاظت کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر حضرت ام حبیبہؓ کا آپ سے نکاح کیا اور بڑے اہتمام سے رخصت کیا۔[۱]

حضرت جعفر کا قافلہ جب روانہ ہونے لگا تو کشتیاں فراہم کیں، سفر کا انتظام کیا اور پورے ساز و سامان کے ساتھ روانہ کیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے رویہ اور سلوک کی اطلاع دیں، یہ میرا ایک ساتھی (عزیز) آپ حضرات کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا رہا ہے۔ کلمۂ شہادت پڑھا اور کہا کہ آپ حضرات حضور سے درخواست کریں کہ وہ میری مغفرت کی دعا فرمائیں۔ خبر پہنچنے پر نجاشی کے روانہ کردہ شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ جعفر یہاں موجود ہیں آپ ان سے دریافت فرمائیں کہ نجاشی کا رویہ ان کے ساتھ کیسا تھا اور ان کا عقیدہ کیا ہے؟ حضرت جعفر نے تفصیل بتائی اور کہا کہ وہ آپ پر ایمان رکھتے ہیں اور آپ سے دعا کی درخواست کی ہے، آپؐ نے وضو کیا اور تین مرتبہ فرمایا اے اللہ! نجاشی کی مغفرت فرما۔ اس پر مسلمانوں نے آمین کہا۔[۲]

نجاشی کا ۹ھ میں انتقال ہوا۔[۳] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے مدینہ میں منادی کرائی کہ حبشہ کے ایک صالح بندے کا انتقال ہو گیا ہے، لوگو چلو اس کی نماز جنازہ پڑھو، اس کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں: تمہارے بھائی اصحمہ (نجاشی کا نام) کا انتقال ہو گیا ہے چلو اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے چنانچہ آپ لوگوں کو لے کر عیدگاہ تشریف لے گئے اور نماز پڑھی۔[۴]

---

[۱] اس کی پوری تفصیل برہان الدین حلبی نے بیان کی ہے۔ السیرۃ الحلبیہ: ۲/ ۷۵۸ - ۷۵۹

[۲] ابن کثیر، السیرۃ النبویہ: ۲/ ۱۶

[۳] علامہ ابن کثیر کہتے ہیں کہ سہیلی کے بقول نجاشی کی موت رجب ۸ھ میں ہوئی لیکن یہ قابلِ غور ہے۔ السیرۃ النبویہ: ۲/ ۳۰۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اکثر اصحابِ علم کے نزدیک نجاشی کی موت ۹ھ میں ہوئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اُن کا انتقال ۸ھ میں فتح مکہ سے پہلے ہوا تھا۔ فتح الباری: ۷/ ۵۸۸۔

[۴] بخاری کتاب مناقب الانصار، باب موت النجاشی۔ یہ روایت بخاری کتاب الجنائز کے متعدد ابواب میں آئی ہے۔ نیز ملاحظہ ہو، مسلم کتاب الجنائز باب فی التکبیر علی الجنازہ۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ آپ نے نجاشی کی نماز جنازہ اس لیے پڑھی کہ حبشہ میں ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی تھی۔ اُن کے قریب ایسے لوگ نہیں تھے جو اسلام پر ایمان رکھتے اور نماز جنازہ پڑھتے ہوں[1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نجاشی کس طرح کے ماحول میں گھرے ہوئے تھے اس طرح کے حالات اور ماحول میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے انھوں نے جو کچھ کیا شاید اس سے زیادہ وہ نہیں کر سکتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مجبوریوں اور معذوریوں کے ساتھ ان کے ایمان اور خلوص کی تصدیق فرمائی۔ ان کی نماز جنازہ پڑھی اور مغفرت کی دعا فرمائی۔ ان کی کامیابی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔

---

[1] ابن کثیر، السیرۃ النبویہ: ۲/ ۲۹، ۳۰، غائبانہ نماز جنازہ پر فقہاء کے درمیان اختلاف ہے تفصیل کے لیے دیکھی جائے فتح الباری: ۳/ ۵۴۴ - ۵۴۵

اعتذار

اس شمارہ کے ساتھ مجلہ تحقیقاتِ اسلامی کی انیسویں[۱۹] جلد مکمل ہو رہی ہے۔ الحمدللہ اس عرصہ میں یہ پوری پابندی اور تسلسل کے ساتھ وقت پر شائع ہو رہا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مدیر محترم کی مسلسل مصروفیات، علالت اور بعض دیگر وجوہ سے اس شمارے کے منظر عام پر آنے میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ امید ہے قارئین کرام اس کوتاہی سے درگزر فرمائیں گے۔ انشاء اللہ آئندہ مجلہ کو وقت پر شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(ادارہ)

تحقیق وتنقید

تخریجِ احادیث
ایک تعارف

حافظ افتخار احمد

اسلامی قانون کے دو بنیادی ماخذ ہیں ایک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن مجید اور دوسرا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث۔ قرآن میں بیسیوں احکام مجمل ہیں اور اللہ نے خود قرآن میں ان مجمل احکام کے بیان وتفسیر کا پہلا حق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات صحابہ کرام کے استفسار پر مجمل احکام کی تشریح کا فریضہ سرانجام دیا۔

جب تدوینِ تفسیر وحدیث کا باضابطہ آغاز ہوا تو علماء متقدمین نے جہاں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے استشہاد کیا وہاں ان کو مع اسناد بیان کیا۔ یہ کام ہمیں تفسیر وحدیث کی ابتدائی کتب میں نظر آتا ہے۔

اس کے بعد جب علوم کی تقسیم ہوئی اور ہر علم مستقل حیثیت اختیار کر گیا اور اس فن کے ماہرین کو اپنی تالیفات میں احادیث سے استدلال کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے اپنی کتب میں پوری احادیث ذکر کرنے کی بجائے بعض اوقات حدیث کا کوئی جملہ یا کوئی خاص حصہ یا بعض اوقات حدیث بغیر سند کے ذکر کر دی۔ یہ طریقہ ہمیں عقائد، تفسیر، احکام القرآن، حدیث (کے مختصر مجموعوں) اصولِ فقہ، فقہ، تصوف اور تاریخ میں ملتا ہے اور متاخرین کی کتب میں تو اس کا کثرت سے رواج ہے۔ اب اگر کوئی آدمی کسی کتاب میں درج حدیث کا درجہ یا حیثیت معلوم کرنا چاہے۔ یا یہ جاننا چاہے کہ یہ حدیث کس کتاب میں آئی ہے تو اس کے لیے بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ اس کا احساس علماء کو پہلے ہی ہو گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے متعدد کتب میں درج شدہ

احادیث کی تخریج کی اور اگر کہیں ضرورت محسوس ہوئی تو اس حدیث کا صحت وسقم کے اعتبار سے درجہ بھی متعین کیا۔

اس مقالہ میں تخریجِ حدیث کی لغوی اور اصطلاحی تعریفات ذکر کر کے تخریج کے فوائد اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی جائے گی اور مختصراً اس فن کا تاریخی پس منظر بیان کیا جائے گا۔

لغوی تعریف

لغت میں تخریج کے معنی ہیں دو متضاد چیزوں کا ایک چیز میں جمع ہونا۔ صاحبِ قاموس نے کہا ہے:

عام فیہ تخریج: خصب و	زرخیز و ہرا بھرا ہونا، وارض مخرجۃ ایسی
جذب، وارض مخرجۃ (کمنقشۃ)	زمین جس کے کچھ حصے پر تو سبزہ ہو اور کچھ پر
بنتھا فی مکان دون مکان،	نہ ہو، خرج اللوح تخریجاً، کا مطلب یہ
وخرّج اللوح تخریجاً: کتب	ہے کہ کچھ چیز لکھی جائے اور کچھ چھوڑ دی
بعضا وترك بعضاً. والخرج	جائے۔ "الخرج" سفید و سیاہ دو رنگوں
لونان من بیاض وسواد[1]	کو کہا جاتا ہے۔

تخریج کا اطلاق متعدد معنی کے لیے ہوتا ہے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل زیادہ مشہور ہیں:

استنباط: صاحبِ قاموس نے کہا ہے: والاستخراج والاختراج: الاستنباط[2] (استخراج و اختراج دونوں استنباط کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔)

التدریب: صاحبِ قاموس نے کہا ہے: خرّجہ فی الادب متخرّج، وھو خریج (کفیل) بمعنی مفعول أی مخرّج[3] کسی کو با ادب و مہذب بنانا اور "خریج" مفعول کے معنی میں ہے۔ یعنی اس سے مراد مخرج اور تربیت یافتہ ہے۔

التوجیہ: کہا جاتا ہے: خرّج المسألۃ وجّھھا، ای بیّن لھا وجھاً۔ یعنی مسئلہ کی وجہ بیان کرنا۔

صاحبِ لسان العرب نے کہا ہے: [illegible] الخروج۔ نکلنے کی جگہ

خرج مخرجًا حسنًا وهذا امخرجًا[۴]، اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی کام کے لیے خروج کا اچھا راستہ نکل آئے۔ تخریج کے مذکورہ معنی کی روشنی میں محدثین کی درج ذیل اصطلاح کا مطلب یہ ہوتا ہے: "هذا حديث عُرف مخرجه (ای موضع خروجه" (اس حدیث کا مخرج معلوم ہے) اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس حدیث کے نکلنے کی جگہ معلوم ہے۔ اس سے مراد حدیث کے وہ راوی ہوتے ہیں جنھوں نے اپنے طریقے سے حدیث کی تخریج کی ہے۔

"والخروج نقيض الدخول، وقد اخرجه وخرّج به"[۵]

(خروج، دخول کی ضد ہے جب یہ کہا جاتا ہے۔ کہ فلاں نے اس (حدیث) کی تخریج کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اس (حدیث) کا اخراج کیا ہے۔ یعنی اس حدیث کو ظاہر کیا ہے) اور اسی معنی میں قرآن کریم میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ[۶] (اس کھیتی کی طرح جس نے اپنا خوشہ ظاہر کیا) اس لیے جب محدثین یہ کہتے ہیں اخرجه البخاری تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بخاری نے وہ حدیث لوگوں کے لیے ظاہر کی ہے اور اس کا مخرج بیان کیا ہے۔ یعنی اس حدیث کے راویوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے وہ حدیث اپنے اپنے طریقوں سے بیان کی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اب تک جو کچھ کہا گیا ہے محدثین کے نزدیک یہ لفظ تخریج کے اصل اشتقاق کا بیان ہے۔ یعنی حدیث کے مخرج کا اظہار مع اس کے راویوں کے۔ واللہ اعلم۔

محدثین کے نزدیک تخریج کا مفہوم

محدثین کے نزدیک تخریج کا اطلاق درج ذیل متعدد معانی پر ہوتا ہے۔

تخریج، اخراج کا مترادف ہے۔ یعنی حدیث کو اس کے مخرج کے ساتھ لوگوں کے لیے ظاہر کرنا۔ حدیث کے ان راویوں کا ذکر جنھوں نے اپنے طریقوں سے اس حدیث کو روایت کیا ہو۔ پس جب وہ یہ کہتے ہیں مثلاً "هذا حديث اخرجه البخاری" او "خرّجه البخاری" (بخاری نے اس حدیث کا اخراج کیا ہے یا اس کی تخریج کی ہے) یعنی (بخاری) نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور مستقل اس کا مخرج ذکر کیا ہے[۷]

ابن صلاح نے اپنی مشہور کتاب "علوم الحدیث" میں ذکر کیا ہے۔

للعلماء بالحديث فی تصنيفه طريقتان، احداهما: التصنيف علی الابواب۔ هو تخرجه علی احكام الفقه وغيرها....[۹]

کہ محدثین کے حدیث (کی کتاب) کو تصنیف کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ (اس کتاب) کو ابواب فقہ کے مطابق تصنیف کیا ہے۔

تخریج سے ابن صلاح کی مراد یہ ہے کہ اس حدیث کو ظاہر کیا جائے اور لوگوں کے لیے اس کو روایت کیا جائے۔

۲۔ تخریج کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اس کو کتبِ حدیث سے نکالا جائے اور اس کو روایت کیا جائے۔ اس سلسلے میں علامہ سخاوی اپنی کتاب "فتح المغیث" میں فرماتے ہیں:

اخراج المحدث الاحاديث من بطون الاجزاء والمشيخات والكتب ونحوها وسياقها من مرويات نفسه او بعض شيوخه او اقرانه او نحو ذلك والكلام عليها وعزوها لمن رواها من اصحاب الكتب والدواوين۔[۱۰]

محدث کا حدیث کو کتبِ حدیث اور اپنے مشائخ سے اپنی سند سے روایت کرنا یا اپنے بعض اساتذہ کرام یا اپنے ہم عصروں سے (روایت کرنا) اور اس حدیث کا مرتبہ بیان کرنا اور اگر اس کا کسی کتاب والے نے ذکر کیا ہے تو اس کا مکمل حوالہ دینا۔

تخریج کا اطلاق رہنمائی کے معنی پر کیا جاتا ہے۔ یعنی حدیث کے اصل مصادر کی طرف رہنمائی کرنا اور ان کی نشاندہی کرنا کہ یہ حدیث فلاں مؤلف کی فلاں کتاب میں موجود ہے۔ علامہ مناوی[۱۱] نے اپنی کتاب "فیض القدیر"[۱۲] میں علامہ سیوطی[۱۳] کے قول: بالغت فی تحریر التخریج (میں نے تخریج کو تحریر کرنے میں انتہائی محنت سے کام لیا ہے) کا مفہوم بیان کرتے ہوئے کہا ہے یعنی:۔

اجتهدت فی تهذيب عزو الاحاديث الی مخرجيها من ائمة الحديث من الجوامع والسنن والمسانيد، فلا اعزو إلی شیء منها الا بعد التفتيش

یعنی میں نے حدیث کے بیان اور تنقیح میں حد درجہ کوشش کی ہے اور اس حدیث کو سند کے ساتھ ذکر کیا ہے جہاں ان (مؤلفین) نے اپنی کتب جوامع[۱۴] وسنن[۱۵] اور مسانید[۱۶] میں ذکر کیا ہے میں نے

عن حماله وحمال مخرجه ولا اكتفي بعزوالي من ليس من أهله وان جلّ كعظماء المفسرين" [۱۴]

کسی چیز کو اس کی اصلی حالت اور اس کے راوی کی تفتیش کے بغیر ذکر نہیں کیا اور اس سلسلے میں، میں نے کبھی کسی غیر اہل کی طرف اس حدیث کی نسبت پر اکتفا نہیں کیا خواہ وہ کوئی بڑا مفسر ہی کیوں نہ ہو۔

ڈاکٹر محمود طحان فرماتے ہیں کہ (یہی) تیسرا معنی ہی محدثین کے نزدیک زیادہ مشہور ہے اور تخریج کا لفظ اسی معنی میں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ خاص طور پر آخری زمانہ میں جب کہ لوگوں کی ضرورت کی بناء پر علماء کرام نے احادیث کی تخریج کی ہے۔[۱۵]

تخریج کی اصطلاحی تعریف

التخريج: هو الدلالة على موضع الحديث في مصادره الاصلية التي اخرجته بسنده. ثم بيان مرتبته عند الحاجة۔[۱۶]

حدیث کے مصادر اصلیہ کی نشاندہی کے ساتھ اس کے مرتبہ کو بیان کرنا تخریج کہلاتا ہے۔

تعریف کی شرح

"الدلالة على موضع الحديث" سے مراد ان تالیفات کا ذکر کرنا ہے جن میں وہ حدیث پائی جاتی ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ "بخاری نے اپنی صحیح میں اس حدیث کی تخریج کی ہے یا طبرانی نے اپنے معجم میں اس کا ذکر کیا ہے یا طبرانی نے تفسیر میں اس کو بیان کیا ہے"، تو ان کتب میں اس حدیث کی موجودگی کی طرف رہنمائی کرنا مقصود ہوتا ہے۔ مصادر اصلیہ میں حدیث کے مؤلفین نے اپنے اساتذہ کرام کی اسانید کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی سند حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے جیسے: صحاح ستہ[۱۷]، مؤطا امام مالک[۱۸]، مسند احمد[۱۹]، مسند حاکم[۲۰]، مصنف عبدالرزاق[۲۱] وغیرہ۔ وہ کتب سنن جو مذکورہ بالا کتب کے تابع ہوں جیسے وہ تصانیف جن میں ان کے

مؤلفین نے متعدد کتب کی احادیث کو جمع کیا ہو۔ مثلاً حمیدی[۲۵] کی کتاب "الجمع بین الصحیحین"[۲۶] یا وہ کتابیں جن میں بعض کتبِ احادیث کی اطراف[۲۷] کو جمع کیا گیا ہو۔ جیسے مزی[۲۸] کی کتاب "تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف"[۲۹] یا مذکورہ کتبِ حدیث کی مختصرات جیسے منذری[۳۰] کی "تہذیب سنن ابی داؤد"[۳۱] اس آخری کتاب سے اگرچہ منذری نے اسانید کو حذف کر دیا ہے تاہم اسانید حکماً اس میں موجود ہیں کیونکہ جو محقق بھی سنن ابی داؤد کی کسی بھی روایت کی سند تلاش کرنا چاہے تو اصل کتاب کی طرف رجوع کر سکتا ہے جہاں پر اسے پوری سند تک رسائی حاصل ہو جائے گی۔ تیسری وہ کتب ہیں جو دراصل کسی دوسرے فن میں تحریر کی گئی ہیں جیسے تفسیر، فقہ اور تاریخ وغیرہ۔ لیکن ان کے مؤلفین نے حدیث مع سند ذکر کی ہو، یعنی کسی دوسری کتب سے نہ لی ہو۔ ان کتب میں "تفسیر طبری"[۳۲] اور "تاریخ طبری"[۳۳] اور محمد بن ادریس (امام شافعی)[۳۴] کی کتاب "الام"[۳۵] خاص طور پر قابل ذکر ہیں یہ کتب فن حدیث میں تالیف نہیں کی گئی ہیں بلکہ اصلاً دوسرے فن میں تحریر کی گئی ہیں (جیسا کہ ان کے نام سے ہی ظاہر ہے) لیکن انھوں نے دوسری چیزوں کے ضمن میں احادیث سے استدلال کیا ہے اور ایسا کرتے وقت انھوں نے مذکورہ دو شرائط کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے۔

۱۔ حدیث کو مع سند ذکر کیا جائے۔

۲۔ اور کسی دوسرے مؤلف سے وہ حدیث نہ لی جائے۔

مذکورہ بالا تین اقسام میں درج شدہ کتبِ احادیث کو مصادرِ اصلیہ کہا جاتا ہے۔ باقی وہ تمام کتابیں جن میں بعض سابقہ کتب کے حوالے سے حدیث جمع کی گئی ہوں تو ایسی کتب کو فن تخریج کی اصطلاح میں "تخریج" نہیں کہا جاتا اور یہ حوالہ صرف اس لیے دیا جاتا ہے تاکہ قاری کو معلوم ہو کہ یہ حدیث فلاں کتاب میں موجود ہے، اگر کوئی اصل کتاب سے حدیث دیکھنا چاہے تو آسانی سے دیکھ سکے۔ اس کے علاوہ حدیث کی ایسی کتابیں بھی ہیں جن میں احادیث کسی خاص موضوع سے متعلق جمع کی گئی ہوں، لیکن وہ کتابیں مصادرِ اصلیہ نہیں کہلاتیں۔ جیسے علامہ ابن حجر کی[۳۶] کتاب "بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام"[۳۷] اور اسی ضمن میں وہ کتب بھی شامل ہیں جو

حروفِ تہجی کے اعتبار سے جمع کی گئی ہوں جیسے جلال الدین سیوطی[۹۴۸] کی کتاب "الجامع الصغیر" اور اسی طرح وہ تمام کتب جن میں کتبِ سابقہ سے احادیث جمع کی گئی ہوں جیسے "اربعین نووی[۹۴۹]" اور "ریاض الصالحین[۹۵۰]" یہ کتابیں مصادر اصلیہ تو نہیں کہلاتیں تاہم بوقت ضرورت ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

"بیان مرتبتہ عند الحاجۃ" سے مراد یہ ہے کہ بوقت ضرورت صحت و ضعف کے اعتبار سے حدیث کا مرتبہ بیان کیا جائے تو گویا کہ فنِ تخریج میں حدیث کے مرتبہ کا بیان کوئی بنیادی چیز نہیں، ایک اضافی چیز ہے[۹۵۱]

اسلامیات کے طالب علم کے لیے جن چیزوں کا جاننا نہایت ضروری ہے، ان میں سے ایک فنِ تخریج بھی ہے تاکہ اسے کم از کم حدیث کی بنیادی کتب (مصادر اصلیہ) کا علم ہو، نیز اسے یہ بھی معلوم ہو کہ ان کتب سے حدیث تلاش کرنے کے کیا کیا طریقے ہیں؟ کیونکہ ان مصادرِ اصلیہ سے عدم واقفیت اور ان سے استفادہ کے طریق کار سے لاعلمی کی بنا پر طالب علم اسلام کے بنیادی علم سے براہِ راست واقف نہیں ہو پاتا۔

تخریج حدیث کے فوائد

۱۔ اس مصدر کا علم ہو جاتا ہے جس میں وہ حدیث ہوتی ہے اور اس کتاب کے مؤلف کا علم ہو جاتا ہے۔

۲۔ ایک یا ایک سے زائد کتب میں حدیث کے مقام کا پتہ چلتا ہے۔

۳۔ حدیث کی مختلف اسناد کا علم ہو جاتا ہے کہ سند منقطع ہے یا متصل؟

۴۔ اگر ایک جگہ حدیث صحیح نہ ہو اور دوسری جگہ صحیح ہو تو اس کا علم ہو جاتا ہے۔

۵۔ صحیح اور ضعیف کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔

۶۔ حدیث کے مرتبے کا علم ہو جاتا ہے کہ اس حدیث کے بارے میں محدثین کے اقوال کیا ہیں۔

۷۔ اگر کسی ایک جگہ راوی چھوٹ گیا ہو تو دوسری جگہ سے اس کا پتہ چل جاتا ہے۔

۸۔ مبہم راوی کی تعیین ہو جاتی ہے۔

۹۔ حدیث معنعن اور تدلیس کا پتہ چل جاتا ہے۔
۱۰۔ اختلاطِ حدیث کا زوال، کیونکہ بعض دفعہ بڑھاپے میں ذہن مختلط ہوجاتا ہے۔
۱۱۔ اگر کوئی راوی اپنی کنیت، لقب یا نسبت استعمال کرلے تو اس کی روایت کا صحیح علم ہوجاتا ہے۔
۱۲۔ روایت میں حدیث کے زیادہ الفاظ کا علم ہوجاتا ہے۔
۱۳۔ غریب الفاظ کی شرح ہوجاتی ہے۔
۱۴۔ نقص اور کمی کا علم ہوجاتا ہے۔
۱۵۔ روایت باللفظ کی وضاحت ہوجاتی ہے۔
۱۶۔ کسی واقعے کے زمانے اور جگہ کا علم ہوجاتا ہے۔
۱۷۔ کاتب کے سہو اور غلطی کا علم ہوجاتا ہے۔
۱۸۔ محدثین کی معرفت اور ان کا تعارف ہوجاتا ہے۔[۴۳]

تخریج کی اہمیت

تخریج کی اہمیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ کسی بھی طالب علم کے لیے کسی حدیث سے استدلال و استشہاد کرنا صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ اسے یہ معلوم ہو کہ اس حدیث کو کسی مستند کتاب کے مؤلف نے اپنی کتاب میں جگہ دی ہے اور اس سے استفادہ کس طرح ممکن ہے؟ گویا کہ تخریج اسلامی علوم و معارف تک پہنچنے کے لیے سیڑھی کی حیثیت رکھتا ہے اور اصولِ فقہ کا ایک قاعدہ ہے: "کل مالایتمّ بہ واجب فھو واجب"۔ اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ویسے تو ہر محقق کو اس کی ضرورت ہے، لیکن خاص طور پر ایسا آدمی جو اسلامی علوم اور اس سے متعلقہ دیگر موضوعات سے متعلق تحقیق کا طالب ہو تو اس کے لیے اس فن کی معرفت اور اس کی ضرورت دوچند ہوجاتی ہے۔

تخریج کا تاریخی پس منظر

قدیم علماء اور محققین کو اصولِ تخریج جاننے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ حدیث

کے مصادرِ اصلیہ کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع ہوتی تھیں اور حدیثِ رسولؐ کے ساتھ ان کا تعلق بڑا مضبوط ہوتا تھا اس لیے انھیں جب کبھی حدیث سے استدلال و استشہاد کی ضرورت پڑتی تو کتبِ حدیث سے اسے تلاش کرنے میں انھیں زیادہ زحمت نہیں پیش آتی تھی۔ کئی سو سال تک صورتِ حال اطمینان بخش رہی۔ لیکن جب علماءِ دین کی معلومات کا دائرہ سکڑنا شروع ہوگیا اور حدیث کے مصادرِ اصلیہ کے بارے میں ان کی معلومات کم سے کم تر ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ متقدمین نے جن احادیث سے اپنی کتب میں علوم شرعیہ وغیرہ (جیسے فقہ، تفسیر اور تاریخ وغیرہ) مرتب کیے تھے، ان احادیث کے مصادرِ اصلیہ کی معرفت تک مشکل ہوگئی تو بعض علماء نے اس طرف خاص توجہ کی اور جو کتابیں حدیث کے علاوہ دوسرے علوم میں لکھی گئی تھیں ان میں درج احادیث کی تخریج کی اور ان کے مصادرِ اصلیہ کی نشاندہی کی اور حسبِ ضرورت ان احادیث کے مراتبِ صحت وضعف پر کلام کیا۔ اس طرح وہ کتابیں منصۂ شہود پر آئیں جنھیں آج کتبِ تخریج کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمود طحان[۴۴] کی تحقیق کے مطابق اس سلسلے کی سب سے پہلی کتاب "تخریج الفوائد المنتخبہ الصحاح والغرائب[۴۵]" ہے جسے شریف ابوالقاسم الحسینی[۴۶] نے تحریر کیا اور خطیب بغدادی[۴۷] نے اس کی تخریج کی۔ اس سلسلے کی دوسری تالیف ابوالقاسم المہرانی[۴۸] کی ہے جس کا نام "تخریج الفوائد المنتخبۃ الصحاح والغرائب[۴۹]" ہے۔ اس کی تخریج بھی خطیب بغدادی نے کی ہے۔ مذکورہ دونوں کتابیں اب تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی ہیں اور مخطوطہ کی شکل میں موجود ہیں۔

اس سلسلے کی تیسری کتاب محمد بن موسیٰ الحازمی شافعی[۵۰] کی "تخریج احادیث المہذب[۵۱]" ہے۔ مہذب[۵۲] کا شمار فقہ شافعی کی اہم کتب میں ہوتا ہے۔ اسے ابواسحاق شیرازی[۵۳] نے تالیف کیا ہے۔ پھر اس کے بعد متعدد اہل علم نے اس فن میں مختلف کتب تالیف کیں۔ اس طرح ان اہلِ علم نے ایک طرف تو ان کتب کی احادیث کی تخریج کی خدمت کی ہے اور دوسری طرف حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی بھی گراں قدر خدمت سرانجام دی اور ان کتب میں پائے جانے والے اس خلا کو پورا کر دیا ہے جو ان احادیث سے متعلق پوری معلومات درج نہ کرنے کی

وجہ سے پیدا ہوا تھا - امر واقع یہ ہے کہ اگر یہ علماء کرام اس خدمت کو سرانجام نہ دیتے تو علوم شرعیہ کی ان تصانیف میں بڑا نقص ہوتا جو ان علماء کی گراں قدر خدمت کی وجہ سے اب دور ہو گیا ہے۔ جزاھم اللہ عنّا احسن الجزاء۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ حالات کافی تبدیل ہو چکے ہیں اور صورتِ حال یہ ہے کہ بہت سے ایسے لوگ جو علوم شرعیہ میں تحقیق کرتے ہیں، اگر کسی کتاب میں کوئی حدیث دیکھ لیں تو حدیث کے مصادرِ اصلیہ سے عدمِ واقفیت کی وجہ سے انھیں اس حدیث کی اصل نص تک رسائی کے طریقۂ کار تک کا علم نہیں ہوتا - اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان کتبِ حدیث کی ترتیب وطریق کار سے لاعلمی ہے اور اگر یہ پتہ چل بھی جائے کہ یہ حدیث فلاں کتاب میں موجود ہے تب بھی اس دور کا ایک عام طالب علم وہاں تک رسائی میں اپنے لیے بڑی مشکل محسوس کرتا ہے اور اس کا سبب بھی ان کتب کی ترتیب وطریق کار سے عدمِ واقفیت ہے۔

(تخریج حدیث پر محدثین نے زبردست خدمات انجام دی ہیں۔ اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس مضمون کو اس موضوع کی تمہید ہی کہا جا سکتا ہے۔ جلال الدین)

حواشی ومراجع

۱؎ القاموس: ۱/۱۹۱-۱۹۲

۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً

۴؎ لسان العرب: ۲/۲۴۹ ۵؎ ایضاً

۶؎ سورۃ الفتح، آیۃ: ۲۹

۷؎ اصول التخریج ودراسۃ الاسانید (الدکتور) محمود طحان، ص: ۱۰

۸؎ علوم الحدیث لابن الصلاح: ص ۲۲۸

۹؎ ایضاً

۱۰؎ فتح المغیث للسخاوی، ۲/۳۳۸

۱۱؎ المناوی: عبدالرؤف بن تاج العارفین بن علی المناوی الشافعی (م ۹۵۲ھ) ہدیۃ العارفین: بغدادی ۱/۵۰۷-۵۱۱، فہرس الفہارس للکتانی: ۲/۳-۴، البدر الطالع للشوکانی ۱/۳۵۷

۱۲؎ یہ علامہ سیوطی کی کتاب الجامع الصغیر کی شرح ہے جس میں مناوی نے سیوطی کا تعاقب کیا ہے۔ یہ کتاب

الجامع الصغیر کے ساتھ مطبع مصطفیٰ محمد، قاہرہ سے چھ ضخیم جلدوں میں ۱۳۵۶ھ میں طبع ہو چکی ہے۔

۱۳؎ سیوطی: عبدالرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر الشافعی (جلال الدین، ابوالفضل) (۸۴۹-۹۱۱ھ) حالات کے لیے دیکھیں: النور اللامع للسخاوی، ۴/۶۹-۷۰، شذرات الذہب لابن العماد ۸/۵۱-۵۵۔ الکواکب السائرہ للغزی، ۱/۲۲۶-۲۳۱، البدر الطالع للشوکانی، ۱/۳۲۸-۳۳۵۔ ہدیۃ العارفین للبغدادی، ۱/۵۳۴۔ ۵۴۴، حسن المحاضرۃ للسیوطی، ۱/۱۸۸-۱۹۵، معجم المؤلفین، عمر رضا کحالہ: ۵/۱۲۸-۱۲۹

۱۴؎ فیض القدیر شرح الجامع الصغیر ۱/۲۰

۱۵؎ جوامع، جامع کی جمع ہے۔ جامع محدثین کی اصطلاح میں حدیث کی ایسی کتاب کو کہتے ہیں جس میں حدیث کی وہ تمام اقسام پائی جاتی ہیں جن کی انسان کو ضرورت پڑتی ہے۔ جیسے عقائد احکام، کھانے پینے اور سفر و حضر کے احکام، اسی طرح تفسیر، تاریخ، فتن، مناقب وغیرہ۔ مثلاً الجامع الصحیح للبخاری، الجامع الصحیح لمسلم، جامع الترمذی۔ اصول التخریج للطحان، ص: ۱۱۰

۱۶؎ "سنن" محدثین کی اصطلاح میں حدیث کی ان کتب کو کہا جاتا ہے جو ابواب فقہ پر مرتب کی گئی ہوں اور صرف احادیث مرفوعہ پر مشتمل ہوں۔ الرسالۃ المستطرفہ للکتانی، ص: ۳۲

۱۷؎ مسانید ان کتب حدیث کو کہا جاتا ہے جن میں ہر صحابی کی احادیث الگ الگ ذکر کی گئی ہوں۔ مثلاً مسند احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) و مسند ابوبکر عبداللہ بن الزبیر الحمیدی (۲۱۹ھ) وغیرہ۔ اصول التخریج، ص: ۴۰ اور بعض اوقات محدثین کے نزدیک مسند کا اطلاق ایسی کتاب پر ہوتا ہے جس میں احادیث فقہی ترتیب یا حروف تہجی کے مطابق جمع کی گئی ہوں، جیسے مسند بقی بن مخلد الاندلسی (۲۷۶ھ) الرسالۃ المستطرفہ ص: ۷۴-۷۵

۱۸؎ اصول التخریج، ص: ۱۲

۱۹؎ حوالہ سابق۔

۲۰؎ یعنی حدیث نبوی کی مستند چھ کتابیں جن کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے اور وہ یہ ہیں صحیح بخاری صحیح مسلم، جامع الترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ۔

۲۱؎ امام مالک: مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمرو الاصبحی المدنی۔ ۱۴ ربیع الاول (۹۳-۱۷۹ھ) میں فوت ہوئے۔ سیر اعلام النبلاء ۶/۱۵۹-۱۸۲، تذکرۃ الحفاظ لابن عبدالہادی، ۲/۴۹ وغیرہ

۲۲؎ یہ کتاب امام احمد بن حنبل (۱۶۴-۲۴۱ھ) کی تالیف ہے۔ چھ ضخیم جلدوں میں دارالفکر، بیروت سے شائع ہو چکی ہے۔ امام احمد کے حالات کے لیے دیکھیں، تاریخ دمشق، ابن عساکر ۱/۶۱-۸۳، سیر اعلام النبلاء، ۸/۱۹۷۵، الکاشف للذہبی، ۲/۷، طبقات الاولیاء ۱/۱۸۲-۱۸۴

۲۳ھ حاکم: محمد بن عبداللہ بن محمد حمدویہ نیشاپوری ہے جو ابوعبداللہ الحاکم کے نام سے مشہور ہیں۔ ۳ ربیع الاوّل ۳۲۱ھ کو نیشاپور میں پیدا ہوئے اور ۸ صفر ۴۰۵ھ کو نیشاپور ہی میں وفات پائی۔ سیر اعلام النبلا ۱۱/۴۰، طبقات الشافعیۃ للسبکی ۱/۱۲۴-۱۲۵، تاریخ بغداد للبغدادی، ۵/۴۷۳ - ۴۷۰، وفیات الاعیان لابن خلکان، ۱/۴۱۳ - ۴۱۴ - طبقات الشافعیہ، ۳/۱۳-۷۲ - المنتظم لابن الجوزی۔ ۷/۶۷۴ - ۶۷۵، لسان المیزان لابن حجر، ۵/۲۳۳-۲۳۴ - تذکرۃ الحفاظ للذہبی، ۳/۲۲۷-۲۳۳ - البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۳۵۵، میزان الاعتدال للذہبی ۳/۸۵ - الکامل فی التاریخ لابن اثیر، ۹/۸۶ - شذرات الذہب لابن العماد: ۳/۱۷۶

۲۴ھ عبدالرزاق: ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی (۱۲۷ - ۲۱۱ھ) یہ کتاب گیارہ ضخیم جلدوں میں حبیب الرحمٰن الاعظمی کی تحقیق کے ساتھ مجلس علمی نے مطابع دارالقلم، بیروت سے ۱۳۹۰ھ - ۱۹۷۰ء میں شائع کی ہے اور یہ اہلِ علم میں متداول ہے۔

۲۵ھ محمد الحمیدی (۴۲۰ - ۴۸۸ھ/۱۰۲۹ - ۱۰۹۰ء) محمد بن فتوح بن عبداللہ بن فتوح بن حمید الازدی الحمیدی الاندلسی المیورقی۔ ابوعبداللہ، محدث، حافظ، اصولی، مورخ، ادیب، اصلاً من قرطبہ، اندلس کے میورقہ جزیرہ میں ۴۲۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ابن حزم ظاہری کے مذہب پر تھے۔ ابن عبدالبر سے بھی علم حاصل کیا۔ ۱۷ ذی الحجہ ۴۸۸ھ کو بغداد میں وفات پائی۔ الجمع بین الصحیحین، الذہب المسبوک فی وعظ الملوک، جذوۃ المقتبس فی ذکر ولاۃ الاندلس، تسہیل السبیل فی علم الترسیل حمیدی کی اہم تصانیف ہیں۔ ملاحظہ کیجئے: معجم المؤلفین ۱۱/۱۲۱-۱۲۲ - وفیات الاعیان لابن خلکان ۱/۴۱۴ - ۴۱۵ - معجم الادباء، ۱۸/۱۲۸۷-۱۲۸۷ - الوافی للصفدی، ۴/۱۸ - ۷ - ۳۱ - النجوم الزاہرۃ لابن تغری، ۵/۱۵۷ - تذکرۃ الحفاظ، ۴/۱۷، الکامل فی التاریخ، ابن الاثیر ۱۰/۸۸ - البدایۃ والنہایۃ ۱۲/۱۵ - شذرات الذہب، ۳/۳۹۲

۲۶ھ الجمع بین الصحیحین حدیث میں حمیدی کی اہم تصنیف ہے۔ یہ اب تک مخطوط کی شکل میں ہے۔

۲۷ھ اطراف "طرف" کی جمع ہے۔ طرف الحدیث: حدیث کا کوئی جزء جو اس حدیث کے بقیہ متن پر دلالت کرے۔ جیسے حدیث "کلم راع وکلم مسئول" و"بنی الاسلام علی خمس" وغیرہ۔ اصول التخریج، ص: ۴۸

۲۸ھ مزی، الحافظ جمال الدین ابوالحجاج یوسف بن عبدالرحمٰن المزی (م ۷۴۲ھ)

۲۹ھ اس کتاب میں علامہ مزی نے صحاح ستہ کے ساتھ درج ذیل کتب حدیث میں مذکور اطراف حدیث کو ذکر کیا ہے۔ مقدمہ صحیح مسلم۔ کتاب المراسیل لابی داؤد۔ کتاب العلل الصغیر للترمذی۔ کتاب الشمائل للترمذی۔ کتاب عمل الیوم واللیلۃ للنسائی، مزی کی اس کتاب میں احادیث کی تعداد ۱۹۹۵ ہے۔ اصول التخریج

ص : ۵۱ - ۵۳ ۔ یہ کتاب ۱۴ ضخیم جلدوں میں عبدالصمد شرف الدین کی تصحیح کے ساتھ دارالباز، عباس احمد الباز مکۃ المکرمہ سے شائع ہوئی ہے ۔

۳۰ منذری : عبدالعظیم بن عبدالقوی بن عبداللہ بن سلامہ بن سعد المنذری الشافعی زکی الدین ابو محمد (۵۸۱ - ۶۵۶ ھ) متعدد کتب تالیف کیں۔ حالات کے لیے دیکھیں : طبقات الشافعیۃ للسبکی ۱۰۸ - ۱۸۸، البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر ۱۳/۲۱۲ ۔ تذکرۃ الحفاظ للذہبی، ۴/۲۲۰ - ۲۲۱ ۔ النجوم الزاہرۃ لابن تغری بردی، ۷/۱۳ ۔ فوات الوفیات، محمد بن شاکر الکتبی، ۱/۲۹۷ ۔ شذرات الذہب لابن العماد ۵/ ۲۷۷ - ۲۷۸ ۔ ہدیۃ العارفین للبغدادی، ۱/۵۸۷ ۔ معجم المؤلفین، ۵/۲۷۴ ۔

۳۱ یہ کتاب ابوسلیمان الخطابی کی معالم السنن اور احمد محمد شاکر اور محمد حامد الفقی کی تحقیق کے ساتھ آٹھ ضخیم جلدوں میں المکتبہ الاثریہ، سانگلہ ہل فیصل آباد پاکستان سے ۱۹۷۹ء/۱۳۹۹ھ میں شائع ہو چکی ہے ۔

۳۲ اس تفسیر کا پورا نام جامع البیان من تاویل ای القرآن ہے ۔ تالیف : محمد بن جریر طبری (۳۱۰ ھ) مؤلف کے حالات کے لیے دیکھیں ۔ شذرات الذہب، ۲/۲۷۰ الکامل فی التاریخ لابن الاثیر ۸/۱۳۴ - ۱۳۷ ۔ والنجوم الزاہرۃ، ۳/۲۵۰ ۔ وکشف الظنون، ۱/۴۳۷ ، یہ تفسیر بالماثور کی سب سے ضخیم کتاب ہے ۔ جو تیس جلدوں میں متعدد بار زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے ۔

۳۳ تاریخ طبری، محمد بن جریر الطبری (م ۳۱۰ ھ) اس کتاب کا پورا نام "تاریخ الرسل والامم والملوک" ہے ۔ متعدد دفعہ طبع ہو چکی ہے ۔ ایک مرتبہ مطبعہ الاستقامہ القاہرہ ۱۹۳۹/۱۳۵۸ میں بھی شائع ہوئی ہے ۔

۳۴ امام شافعی : محمد بن ادریس بن العباس ابن شافع القرشی، المطلبی، الشافعی، الحجازی المکی (ابوعبداللہ) (۱۵۰ - ۲۰۴ ھ) ائمہ اربعہ میں سے ایک امام ہیں ۔ جن کی طرف شافعی مذہب کی نسبت ہے ۔ غزہ (فلسطین) میں پیدا ہوئے اور مصر میں وفات پائی ۔ تفصیلی حالات کے لیے دیکھیں تاریخ بغداد، للبغدادی ۲/۵۶-۱۰۳، الفہرست لابن ندیم، ۱/۲۰۹، وفیات الاعیان لابن خلکان، ۱/۵۶۵ - ۵۶۸ ۔ تہذیب الاسماء واللغات للنووی، ۱/۴۴-۶۷ ۔ معجم الادباء، ۱۷/۳۸۱ - ۳۲۱ ۔ تہذیب التہذیب، ۹/۲۰-۳۱ ۔ الکامل فی التاریخ لابن الاثیر، ۶/۲۲ ۔ معجم المؤلفین، ۹/۳۲ ۔ النجوم الزاہرۃ، ۲/۱۷۶-۱۷۷ ۔

۳۵ یہ فقہ شافعی کی اہم کتاب ہے جسے خود امام محمد بن ادریس شافعی (م ۲۰۴ ھ) نے تحریر کیا ہے ۔ اس میں مؤلف نے تمام فقہی ابواب مع دلائل ذکر کئے ہیں ۔ اس کتاب میں امام شافعی نے نقلی دلائل سے اپنے مذہب کا بھرپور دفاع کیا ہے ۔ یہ کتاب متعدد بار طبع ہو چکی ہے ۔

۳۶ ابن حجر : احمد بن علی بن محمد الکنانی العسقلانی (۷۷۳ - ۸۵۲ ھ) ابن حجر اصلا عسقلان (فلسطین) سے

تعلق رکھتے تھے۔ قاہرہ میں پیدا ہوئے اور قاہرہ میں ہی وفات پائی حالات کی تفصیل کے لیے دیکھیں:
الاعلام، خیر الدین الزرکلی، ۱/ ۱۷۹

۳۷؎ اس کتاب کے دو جزو ہیں۔ ایک ہی جلد میں متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ مکتبہ دارالسلام لاہور سے مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کی شرح و تعلیق "اتحاد الکرام" کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ نیز اس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالوکیل علوی نے کیا ہے، جس پر نظر ثانی ارشاد الحق اثری نے کی ہے۔ یہ ترجمہ بھی مذکورہ مکتبہ سے طبع ہو چکا ہے۔

۳۸؎ ملاحظہ کیجئے حاشیہ نمبر ۱۳

۳۹؎ اس کتاب کا پورا نام الجامع الصغیر من حدیث البشیر والنذیر ہے۔ اس سے پہلے سیوطی نے ایک اور کتاب لکھی تھی جس کا نام "جمع الجوامع" تھا۔ یہ بہت بڑی کتاب تھی اس لیے علامہ سیوطی نے اسے مختصر کیا۔ اس میں احادیث کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے جمع کیا گیا ہے۔ مطبوعہ نسخہ کے مطابق اس میں احادیث کی تعداد دس ہزار اکتیس ہے (۱۰۰۳۱) ہے۔ اصول التخریج ص: ۷۲-۷۴۔ یہ کتاب مع شرح فیض القدیر للمناوی مطبع مصطفیٰ محمد، قاہرہ سے ۱۳۵۷ھ میں شائع ہو چکی ہے۔

۴۰؎ جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے اسے امام ابو زکریا یحییٰ بن شرف الدین النووی الدمشقی (۶۳۱ - ۶۷۶ھ) نے تالیف کیا ہے۔ اس کتاب میں کل چالیس حدیثیں ہیں، جو سب کی سب صحیح ہیں۔ ان میں زیادہ حدیثیں صحیح بخاری و مسلم سے لی گئی ہیں۔ یہ تمام حدیثیں دین کے بنیادی اصول و قواعد پر مشتمل ہیں۔ یہ کتاب متعدد بار طبع ہو چکی ہے اور کئی اہل علم نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔

۴۱؎ اس کتاب کا پورا نام "ریاض الصالحین من کلام سید المرسلین" ہے۔ یہ بھی یحییٰ بن شرف الدین نووی کی تالیف ہے۔ اس میں امام نوویؒ نے عقیدہ اور عملی زندگی کے اکثر و بیشتر مسائل سے متعلق صحیح احادیث جمع کی ہیں۔ اس کتاب میں کل ۱۸۹۶ حدیثیں ہیں، جو پندرہ عنوانات کے تحت مذکورہ ہیں۔ یہ کتاب متعدد ابواب پر مشتمل ہے۔ مؤلف نے پوری کتاب میں ایک ہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ پہلے باب کا عنوان پھر اس کی مناسبت سے ایک یا ایک سے زائد قرآنی آیات اور اس کے بعد متعدد حدیثیں نقل کی ہیں۔ یہ کتاب متعدد بار زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے اور اہل علم میں مشہور ہے۔ متعدد زبانوں میں اس کے تراجم بھی ہو چکے ہیں۔

۴۲؎ اصول التخریج، ص: ۱۴

۴۳؎ حوالہ سابق، ص: ۱۵-۱۷ بتصرف

۴۴ د۔محمود طحان : جامعہ امام بن سعود کی فیکلٹی آف اصول الدین میں حدیث کے پروفیسر ہیں۔

۴۵ یہ کتاب مخطوطہ کی شکل میں ہے۔ اصول التخریج ،ص ۱۶

۴۶ ان کے حالات تلاشِ بسیار کے باوجود نہ مل سکے۔

۴۷ ان کا نام : ابوبکر احمد بن علی ابن ثابت البغدادی (۳۹۲-۴۶۳ھ) (۱۰۰۲-۱۰۷۳ء) ہے۔ حالات کے لیے دیکھیں : المنتظم ابن الجوزی ۱۲/۱۲۹-۱۳۵، النجوم الزاہرۃ ، ۵/۸۷-۸۸ ، البدایۃ والنہایۃ ، ۱۲/۱۰۱-۱۰۳ شذرات الذہب ،۳/۳۱۱-۳۱۲۔

۴۸ اصول التخریج ،ص : ۱۶، ان کے حالات تلاش کے باوجود نہیں مل سکے۔

۴۹ سابق مرجع ۱۶۱، اس کتاب کا ایک نسخہ (فوٹو اسٹیٹ) مرکز البحث العلمی، مکہ مکرمہ میں ۲۲۸ پر حدیث سیکشن میں موجود ہے۔ تخریج الاحادیث الواردۃ فی مدوّنۃ امام مالک ، ۱/۴۶)

۵۰ حازمی : محمد بن موسیٰ عثمان بن عثمان بن حازم الحازمی (۵۴۸ھ) ہے۔ ابوبکر کنیت ہے۔ شافعی المسلک ہیں۔ مؤرخ فقیہ ہیں۔ متعدد کتب تالیف کی ہیں۔ ان میں الاعتبار فی بیان الناسخ والمنسوخ من الحدیث، شروط الائمۃ الخمسۃ بخاری ومسلم وابوداؤد والنسائی و الترمذی ، المتیدی فی الانساب اور المؤتلف والمختلف فی اسماء الاماکن والبلدان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مزید حالات کے لیے دیکھیں۔ وفیات الاعیان لابن خلکان ۱/۱۹-۱۸، طبقات الشافعیہ للسبکی، ۷/۱۸۹-۱۹۵۔ تہذیب الاسماء واللغات للنووی، ۲/۱۹۲۔ تذکرۃ الحفاظ للذہبی، ۴/۱۵۱-۱۵۳۔ البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر، ۳۳۲۔ شذرات الذہب لابن العماد، ۴/۲۸۲

۵۱ الرسالۃ ص :۱۴۲۔ واصول التخریج ،ص : ۱۶

۵۲ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ امام یحییٰ بن شرف الدین نووی (۶۷۶ھ) نے "المجموع" کے نام سے "مہذّب" کی شرح لکھی ہے۔ فقہ شافعی کی یہ سب سے جامع شرح ہے۔ نووی اس کی تکمیل سے قبل ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ یہ شرح قاہرہ سے نو (۹) ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

۵۳ فیروزآبادی : ابواسحاق ابراہیم بن علی بن یوسف الشیرازی الفیروزآبادی (۴۷۶ھ) ہے۔ مہذب کے علاوہ بھی ان کی تالیفات ہیں۔ النکت فی الخلاف ، اللمع وشرحہ ، التبصرہ فی اصول الفقہ۔ حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے۔ معجم المؤلفین ۱۰/۶۸-۶۹، شذرات الذہب ،۳/۳۴۹-۳۵۱۔ البدایۃ والنہایۃ : ۱۲/۱۲۴-۱۲۵، طبقات الشافعیہ للسبکی ،۳/۸۸-۱۱۱ ، تہذیب الاسماء واللغات ، ۲/۱۷۲-۱۷۴۔

آثار البلاد
فنِ تراجم کا ایک اہم ماخذ

جمشید احمد ندوی

فنِ ترجمہ نگاری مسلمانوں کا خالص ایجاد کردہ فن ہے۔ اس فن کے متعدد علماء و فضلاء نے مختلف النوع تصانیف بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ یہ کتابیں اس بات کی آئینہ دار ہیں کہ ہمارے اسلاف میں کیسے کیسے نادرۂ روزگار افراد موجود تھے جنھوں نے مختلف علوم و فنون میں اپنے لازوال کارناموں کے نقوش ثبت کر دئے ہیں، جو ہمارے لیے یہ سبق فراہم کرتے ہیں کہ ان کی سی لگن و محنت اور علم کے حصول کے لیے سچی تڑپ آج بھی ویسے ہی افراد پیدا کر سکتی ہے جو امتِ مسلمہ کا سر فخر سے اونچا کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔

فنِ تراجم کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ اس فن کے ماہرین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ بعض نے صرف مشاہیر کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، اس کی سب سے نمایاں مثال ابن خلکان (۶۰۸ - ۶۸۱ھ) کی معروف کتاب وفیات الاعیان ہے۔ بعض اہل قلم نے کسی خاص علاقے کے علماء و فضلاء و مشاہیر کے تراجم یکجا کیے ہیں، اس کا بہترین نمونہ خطیب بغدادی (۳۹۲ - ۴۶۳ھ) کی تاریخ بغداد ہے۔ بعض علماء نے کسی ایک صدی کے علماء و فضلاء کے تراجم جمع کیے ہیں، جیسے ابن حجر (م ۸۵۲ھ) کی "الدرر الکامنۃ" جو آٹھویں صدی کے مشاہیر کے تراجم کا احاطہ کرتی ہے۔ بعض مصنفین بغیر کسی تحدیدِ زمان و مکان کے ہر دور کے اشخاص کے تراجم بیان کرتے ہیں، اس کی عمدہ مثال صفدی (۶۹۶ - ۷۶۴ھ) کی الوافی بالوفیات ہے۔ ان کے علاوہ بعض کتب تراجم ایسی بھی موجود ہیں جو کسی خاص

فن کے ماہرین کے حالات زندگی بیان کرتی ہیں جیسے علامہ سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی بغیہ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ۔

فن ترجمہ نگاری دراصل تاریخ نویسی کا بھی ایک حصہ ہے، اس لیے کہ یہ تاریخ نویسی کے لیے خام مواد فراہم کرتا ہے۔ شخصیات سے ہی تاریخ بنتی ہے اسی وجہ سے مورخین تاریخ نویسی کے ضمن میں مشاہیر کے حالات بیان کرتے ہیں جیسے علامہ ذہبی (م ۷۴۸ھ) کی تاریخ اسلام اور ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) کی البدایۃ والنہایۃ اور ان جیسی تاریخ کی اور کتابوں میں ہزاروں کی تعداد میں تراجم موجود ہیں اسی طرح دیگر موضوعات کی کتب میں بھی اس فن کا بڑا مواد اور سرمایہ بکھرا ہوا ہے۔ اس کو جدید طرز پر مرتب کر دیا جائے تو تراجم کا بڑا ذخیرہ جمع ہو جائے گا اور اس سے استفادہ بھی آسان ہو جائے گا۔

قزوینی (۶۰۰ - ۶۸۲ھ تقریباً) کی آثار البلاد و اخبار العباد بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے جس میں مشاہیر کے چھوٹے بڑے سیکڑوں تراجم آ گئے ہیں حالانکہ اس کتاب کا تعلق فن جغرافیہ سے ہے۔

قزوینی کا شمار فن تاریخ و جغرافیہ کے ماہرین میں ہوتا ہے[۱]، انھیں ان کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے قرون وسطیٰ کے ہیروڈوٹس اور بلینوس کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے جو زمانۂ قدیم کے مشہور و معتبر جغرافیہ نویس اور مورخ تھے[۲]۔

قزوینی کی کتاب "آثار البلاد و اخبار العباد" اسلامی جغرافیہ نویسی کا ایک عمدہ شاہکار ہے جو اس موضوع پر متقدمین کی معلومات سے مزین ہے[۳]۔ اس کی فنی حیثیت سے قطع نظر اس کی اہمیت مزید یوں بڑھ جاتی ہے کہ قزوینی مختلف امصار و ممالک کے جغرافیائی حدود کی تعیین، اس کے باشندوں کی عادات و اطوار کا ذکر کرتے ہوئے اس خطہ کے مشاہیر کا بھی تذکرہ کرتے چلے جاتے ہیں جیسا کہ اس کتاب کے عنوان کے دوسرے حصہ "اخبار العباد" سے آشکارا ہوتا ہے۔

قزوینی کی اس کتاب میں جا بجا بکھرے ہوئے تراجم سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس ضمن میں کوئی باضابطہ اصول یا نظریہ متعین نہیں کیا ہے کہ کن اشخاص کے تراجم بیان کیے جائیں کن کے بیان نہ کیے جائیں۔ بسا اوقات وہ کسی مشہور علاقے

کے تراجم تو بالکل نقل نہیں کرتے ہیں، اس کے برعکس بالکل گمنام علاقوں کے اشخاص کے تراجم ذکر کرتے ہیں سی طرح بہت ہی مشہور و معروف شخصیات کا ترجمہ بہت ہی مختصر ایک دو سطروں میں کرتے ہیں اور بعض کم معروف شخصیات کے تراجم تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ تاہم اس بات کا بالعموم خیال رکھا ہے کہ وہ جس علاقے کے افراد کا ذکر کریں وہ اس علاقہ کے لیے مشہور و معروف ہی ہوں۔

قزوینی کے بیان کردہ تراجم کا دائرہ بہت وسیع ہے اس میں پیغمبرانِ ذی شان، تابعینِ عظام، ادبا و شعرا، جغرافیہ نویس و مورخین، مفسرین و محدثین، فقہاء، علماء و فضلاء، وزراء و امراء، ملوک و اعیان، زہاد و عباد، فلاسفہ، متکلمین، واعظین و ناصحین کے علاوہ متعدد ایسی شخصیات شامل ہیں جنھیں مذکورہ بالا کسی خانہ میں رکھنا ذرا دشوار ہے۔ طوالت کے خوف سے ذیل میں اس کتاب کے مشاہیر کو فن وار تقسیم کرتے ہوئے صرف ان کے ناموں کی فہرست درج کی جارہی ہے جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کتاب میں فن تراجم کا کتنا وقیع اور قابلِ قدر سرمایہ موجود ہے جبکہ اس کا تعلق فنِ جغرافیہ سے ہے[۱۰۸]

پیغمبرانِ ذی شان

اس میں صرف سلسلۂ رشد و ہدایت کی سب سے نمایاں کڑی حضرت ابراہیمؑ (۴۹۴) اور حضرت طالوتؑ کا ترجمہ مذکور ہے (۳۹۸)

صحابۂ کرام

صحابۂ کرام کی مقدس جماعت میں حمی الدبر عاصم بن افلحؓ (۱۰۹) بلیع الارض حبیب بن ثابتؓ، غسیل الملائکہ حنظلہ بن راہبؓ، ذوالشہادتین خزیمہ بن ثابتؓ اور سید الاوس سعد بن معاذؓ کے تراجم مذکور ہیں (۱۱۰) یہ سارے تراجم شہر نبوی مدینہ (یثرب) کے ضمن میں مذکور ہیں، دیگر مقامات کے صحابہ کا ذکر نہیں ہے۔

تابعینِ عظام

صحابۂ کرام کے امین و وارث تابعین عظام میں ابوعبداللہ سعید بن جبیرؒ [م ۹۵ھ] (۲۵۵-۲۵۶) امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ [م ۱۵۰ھ] (۲۵۲-۲۵۳) سفیان بن سعید ثوریؒ [م ۱۶۱ھ] (۲۵۳-۲۵۴) ابوامیہ شریح بن حارث قاضیؒ [م ۸۲ھ] (۲۵۴-۲۵۵)

اور سلیمان اعمشؒ [م ۱۴۸ھ] کے تراجم مذکور ہیں (۴۲۲)

مفسّرین وقرّاء

جماعتِ مفسّرین میں ابوالفرج عبدالرحمٰن بن جوزیؒ [م ۵۹۷ھ] (۳۲۰) حسین بن مسعود فراء بغویؒ (۳۳۰) محمد بن جریر طبریؒ (۴۰۵) ابوعمر قلانسیؒ (۴۷۹) علامہ زمخشریؒ (۵۳۳) اور امام شاطبیؒ کے تراجم مذکور ہیں (۵۳۹)

محدّثین

محدثینِ کرام میں حسب ذیل تراجم ملتے ہیں سلیمان بن احمد بن یوسف طبرانیؒ [م ۳۶۰ھ] (۲۱۸) سفیان ثوریؒ [م ۱۶۱ھ] (۲۵۳-۲۵۴) ابونعیم اصبہانیؒ (۲۹۷) ابو عبداللہ احمد بن محمد بن حنبلؒ [م ۲۴۱ھ] (۳۱۸ - ۳۲۰) ابوبکر بیہقیؒ (۳۳۹) سلیمان اعمشؒ [م ۱۴۸ھ] (۴۲۲) عبداللہ بن مبارکؒ (۴۵۷ - ۴۵۸) یزید بن ہارونؒ (۴۸۰) اور امام بخاریؒ (۵۱۰ - ۵۱۱)

فقہاء

اس جماعت میں ابونصر بن ابوعبداللہ خیاط (۲۱۲) امام ابوحنیفہ [م ۱۵۰ھ] (۲۵۲-۲۵۳) ابوسعید اسماعیل بن احمد جرجانی (۲۵۰) قاضی ابویوسف (۳۱۷) قاضی عمر بن سہلان (۳۸۷ - ۳۸۸) ابوحاتم محمود بن حسن قزوینی (۴۳۶) ابوبکر عبداللہ بن احمد بن عبداللہ قفال مروزی [م ۴۱۷ھ] (۴۵۹) ابواحمد ملقب بہ تاج الدین ارموی (۴۹۴-۴۹۵) ابوبکر محمد بن علی قفال شاشی کے تذکرے ملتے ہیں (۵۲۸)

علماء وفضلاء

اس جماعت کے بعض افراد مذکورہ بالا کسی نہ کسی عنوان کے تحت آسکتے ہیں لیکن چونکہ بالعموم ان کے متعلق کسی قسم کی وضاحت مصنف نے نہیں کی ہے اس لیے ان سارے تراجم کا ذکر ایک عمومی عنوان کے تحت ہم کر رہے ہیں۔ ابوالحسن سیرافی (۲۰۴) ابوالعباس احمد بن سریج (۲۱۱) عمر ملقب بہ رشید الدین فرغانی [م ۶۳۱ھ] (۲۳۶) ابوبکر بن فورک اشعری (۲۹۷) ابوبکر طیب باقلانی (۳۱۲-۳۱۳) ابوعلی حسین بن صالح شافعی [م حدود ۳۲۰ھ] (۳۲۰) بنو الاثیر (۳۵۲) ابوالمعالی عبدالملک بن محمد امام الحرمین [م ۴۷۸ھ] (۳۵۲-۳۵۳) اسعد میہنی (۳۶۱) ابوالمظفر خوافی (۳۶۴)

ابوعلی احمد بن محمد رودباری [م ۳۲۲ھ] (۳۷۳ - ۳۷۴) ابوعبداللہ احمد بن عطار رودباری (۳۷۴) فخر الاسلام ابوالمحاسن رویانی (۳۷۴ - ۳۷۵) تاج الدین کمالان (۳۸۹) ابوالحسن معروف بہ کیا ہراسی (۴۰۵ - ۴۰۶) فخر الائمہ ابوالفضل محمد بن احمد طبسی (۴۰۶ - ۴۰۷) ابومحمد بن احمد بخّار (۴۳۷ - ۴۳۸) ابوالقاسم محمد بن عبدالکریم رافعی [م ۶۲۳ھ] (۴۳۸) قصرانی مہندس (۴۴۰) ابوزید مروزی (۴۵۹) کمال الدین بن یونس (۴۶۳) ابوالفرج بن معافی بن زکریا نہروانی (۴۷۲) ابوسعید بن ابوعثمان خرکوشی (۴۷۶ - ۴۷۷) ابوالحسین بنان بن محمد بن حمدان حمال - (۴۷۹ - ۴۸۰)

ادباء وشعراء

اس عنوان کے تحت حسب ذیل شخصیات کا تذکرہ ملتا ہے - ابوتمام طائی (۷۵۰ - ۷۶) حاتم طائی (۷۶ - ۷۷) ہارون بن عبداللہ مولی الازد (۱۲۲) ابوالحسن اہوازی (۱۵۳) متنبّی [م ۳۵۴ھ] (۲۵۶ - ۲۵۸) ابوالعلاء معرّی (۲۷۲ - ۲۷۳) عبدالملک بن صالح ہاشمی (۲۷۴) ابوالفرج اصفہانی (۲۹۷) ابونواس (۳۲۷ - ۳۲۸) ابوالحسن باخرزی (۳۳۸ - ۳۳۹) ابوزکریا تبریزی (۳۴۰) عبدالقاہر بن عبدالرحمٰن جرجانی (۳۵۱) ابوالحسن علی بن عبدالعزیز (۳۵۰ - ۳۵۱) فارسی شاعر انوری (۳۶۱) فارسی ادیب و شاعر جلال خواری (۳۶۳ - ۳۶۴) ابوالعنبس محمد بن اسحاق (۴۰۰ - ۴۰۱) شمس طبسی (۴۰۷ - ۴۰۸) تاج طرقی (۴۰۸ - ۴۰۹) فارسی شاعری کے سرخیل حکیم فردوسی (۴۱۵ - ۴۱۷) اور مجدود بن آدم سنائی (۴۲۹) عبدالعزیز ملقّب بہ رفیع (۴۴۹) حسن بن علی بن احمد ملقّب بہ افضل ماہاباذی (۴۵۲) ابومحمد قاسم بن علی حریری (۴۶۰) عمر خیّام (۴۷۴ - ۴۷۵) بدیع الزماں ہمذانی [م ۳۹۸ھ] (۴۸۷ - ۴۸۸) مجیر بیلقانی (۵۱۳) ابومحمد نظامی [م نحو ۵۹۰ھ] (۵۲۳) ابن سمنطی مالطی (۵۵۷) افضل الدین خاقانی (۶۰۱) اسمٰعیل بن حماد جوہری اوران کے ماموں اسحاق بن ابراہیم (۶۰۳)

قضاۃ

جن قاضیوں کے تراجم کتاب میں ملتے ہیں وہ یہ ہیں - ابوطیب طاہر بن عبداللہ طبری [م ۴۰۵ھ] (۲۱۷) قاضی شریح [م ۸۲ھ] (۲۵۴ - ۲۵۵) قاضی ابویوسف (۳۱۷) قاضی یحییٰ بن اکثم (۳۱۷ - ۳۱۸) قاضی عمر بن سہلان (۳۸۷ - ۳۸۸) قاضی حسین مرورودی

(۴۵۵) ابو طیّب سہل صعلوکی (۴۷۵-۴۷۶) اور قاضی شمس الدین خوی [م ۶۴۰ھ] (۵۲۷-۵۲۸)

متکلمین اسلام

اس ضمن میں ابوعبداللہ محمد بن عمر رازی [م ۶۰۶ھ] (۳۷۷-۳۷۹) الملل والنحل کے مصنف شہرستانی (۳۹۸) اور حجۃ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد غزالی [م ۵۰۵ھ] کے تراجم بیان کیے گئے ہیں (۴۱۳-۴۱۵)

فلاسفہ وحکماء واطباء

اس جماعت کے فضلاء میں حکیم افضل بامیانی (۱۵۴) احمد بن طیّب سرخسی (۳۹۰) حکیم ابن مقفّع (۴۶۶) عمر خیّام (۴۷۴-۴۷۵) ابونصر بن طرخان فارابی [م ۳۳۹ھ] (۵۴۸) سقراط (۵۶۹) افلاطون (۵۶۹-۵۷۰) ارسطو (۵۷۰-۵۷۱) دیوجانس (۵۷۱) بطلیموس صاحب العلم المجسطی (۵۷۱-۵۷۲) بطلیموس صاحب الاحکام النجومیۃ (۵۷۲) بلیناس صاحب طلسمات (۵۷۲) فیثاغورس (۵۷۲-۵۷۳) اقلیمون (۵۷۳) اقلیدس، ارشمیدس، بقراط (۵۷۳) اور اطباء میں جالینوس (۵۷۳-۵۷۴) جلال طبیب (۳۸۴) اور مسکوی طبیب کے تراجم مصنف نے ذکر کیے ہیں (۳۸۹)

سیرت نگار وجغرافیہ داں

اس ضمن میں صرف سیرت نگار ابوعبداللہ وہب بن منبّہ (۷۲) اور مشہور جغرافیہ داں اصطخری کے مختصر سے تراجم آسکے ہیں۔ (۱۴۸)

زاہدین وعابدین

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قزوینی زاہدین، عابدین، واعظین اور صوفیاء سے بہت زیادہ متاثر تھے کیونکہ ان کے بیان کردہ مشاہیر کے تراجم میں عددی اعتبار سے سب سے زیادہ تعداد زہّاد وعبّاد کی ہی ہے۔ یہاں ان کے اسماء گرامی نقل کیے جارہے ہیں۔ ابوسلیمان داؤد بن نصیر طائی [م ۱۶۵ھ] (۷۴-۷۵) سعید بن سائب (۱۰۰) شیخ صالح سنی بن عبداللہ مراکشی (۱۱۲) ابوالفیض ذوالنون مصری [م ۲۴۵ھ] (۱۴۰) سہل بن عبداللہ تستری [م ۲۸۳ھ] (۱۷۱-۱۷۲) ابوسلیمان عبدالرحمٰن بن عطیہ داری (۱۸۸) حسین بن منصور حلّاج [م ۳۰۹ھ] (۱۶۵-۱۶۸) ابوعبداللہ سابوری

(۲۰۰) ابوعبداللہ محمد بن خفیف (۲۱۲) ابوحامد احمد کرمانی [م ۶۳۵ھ] (۲۴۸) ابوبکر طاہری (۲۸۸) فضیل بن عیاض [م ۱۸۷ھ] (۲۸۹) ابونصر ایرادی (۳۰۳-۳۰۴) ابویزید طیفور بن عیسیٰ بسطامی [م ۲۶۱ھ] (۳۰۸) حسن بصری [م ۱۱۰ھ] (۳۱۱) محمد بن سیرین [م ۱۱۰ھ] (۳۱۱) عمرو بن عبید (۳۱۲) بشر بن حارث حافی [م ۲۲۹ھ] (۳۲۱-۳۲۲) ابوعبداللہ حارث بن اسد محاسبی [م ۲۴۳ھ] (۳۲۲-۳۲۳) جنید بغدادی کے ماموں ابوالحسن سری مغلس سقطی (۳۲۳-۳۲۴) جنید بن محمد بغدادی [م ۲۶۸ھ] (۳۲۴-۳۲۵) ابوالحسن علی بن محمد مرین [م ۳۲۸ھ] (۳۲۵) ابومحمد رُویم بن احمد بغدادی [م ۳۰۳ھ] (۳۲۶) محمد بن اسماعیل معروف بہ خیر النساج (۳۲۵-۳۲۶) ابوسعید احمد بن عیسیٰ خراز (۳۲۶) ابراہیم بن ادہم عجلی [م ۱۶۱ھ] (۳۳۲-۳۳۳) شقیق بن ابراہیم بلخی [م ۱۶۴ھ] (۳۳۳-۳۳۴) ابوحامد احمد بن حضرویہ [م ۲۰۴ھ] (۳۳۴) ابوالخیر بنانی (۳۳۶-۳۳۷) منصور بن عمّار (۳۳۷-۳۳۸) علی جرائی (۳۵۱) محمد بن خالد ملقّب بہ نورالدین (۳۵۴) ابوالعباس احمد بن محمد حویزی (۳۵۸-۳۵۹) ابوعثمان اسماعیل جیری [م ۲۹۸ھ] (۳۶۰) ابوسعید بن ابی الخیر (۳۶۱) ابوعبدالرحمٰن حاتم بن یوسف اصم [م ۲۳۷ھ] (۳۶۲) حبیب عجمی (۳۶۳) ابوالقاسم خرقانی (۳۶۳) ابوجابر رجبی (۳۷۳) ابوعبداللہ احمد بن عطاء روذباری (۳۷۴) ابواسحاق ابراہیم بن احمد خواص (۳۷۹-۳۸۱) یحییٰ بن معاذ رازی [م ۲۵۸ھ] (۳۸۱-۳۸۲) شیخ حیدر (۳۸۲-۳۸۳) قاضی عدۃ (۳۸۸) تاج محمد واعظ معروف بہ شجویہ (۳۸۸-۳۸۹) ابوالفتوح محمد بن یحییٰ ملقّب بہ شہاب الدین (۳۹۴-۳۹۵) ابوالخیر احمد بن اسماعیل ملقّب بہ رضی الدین (۴۰۲-۴۰۳) ملک الابدال احمد بن محمد بن غزالی (۴۱۵) ابوالحسین سمنون بن حمزہ (۴۲۲-۴۲۳) ابراہیم آجری (۴۲۳) ابوالحسن علی بن موفق [م ۲۶۵ھ] (۴۲۴) ابوبکر معروف بہ شابان [م ۶۰۱ھ] (۴۳۶) شیخ ابوالقاسم بن ہبۃ اللہ کوفی (۴۳۶-۴۳۷) ابوعلی حسنویہ بن احمد زبیری ملقب بہ معین الدین (۴۳۸) شجاع باک باز [م نحو ۶۲۰ھ] (۴۳۸-۴۴۰) ابومحفوظ معروف بن فیروز کرخی [م ۲۰۱ھ] (۴۴۴-۴۴۵) عبداللہ بن مبارک [۱۲۰-۱۸۱ھ] (۴۵۷-۴۵۸) ابوالحارث سریج مروزی (۴۵۹-۴۶۰) شیخ فتح موصلی (۴۶۳) ابوتراب عسکر بن حصین نخشبی [م ۲۴۵ھ] (۴۶۶) ابوالقاسم ابراہیم بن محمد نصراباذی [م ۳۳۷ھ] (۴۶۷) ابوالقاسم قشیری [م ۴۶۵ھ] (۴۷۴) ابوحمزہ خراسانی

(۴۷۵) ابوسعید بن ابی عثمان خرکوشی (۴۷۶) ابومحمد عبداللہ بن مرتعش [م ۳۲۸ھ] (۴۷۷) محمد بن العربی ملقب بہ محی الدین (۴۹۷) ابوخالد یزید بن ہارون [م ۲۰۶ھ] (۵۱۱) ابوالجناب احمد بن عمر خیوقی معروف بہ کبری [م نحو ۶۱۰ھ] (۵۲۸-۵۲۹) ابوبکر دلف بن جعفر شبلی [م ۳۳۴ھ] (۵۴۰-۵۴۱) اور زاہد خاتون، رحمت بنت ابراہیم ہزارا سبیہ (۵۶۷)

ملوک و وزراء، اعیان و امراء

قزوینی کی کتاب میدانِ سیاست کی شخصیات کا بھی احاطہ کرتی ہے، جن میں حجاج بن یوسف (۹۹-۱۰۰) فضل بن علان (۱۴۱) افریدون بن کیقباذ (۲۳۳) اسکندر بن دارا، انوشروان بن قباذ، بہرام بن یزدجرد معروف بہ بہرام جور (۲۳۴) جاماسب منجم وزیر کشتاسف بن ہراسب (۲۳۴-۲۳۵) بزرجمہر بن بختکان (۲۳۵) ابوعمر و ملقب بہ کمال الدین [م ۵۹۰ھ] (۲۸۸) ملک مظفر الدین کوکبری صغیر [م ۶۲۹ھ] (۲۹۰) صدر الدین عبداللطیف الخجندی [م ۵۲۳ھ] (۲۹۸) علی بن عیسی وزیر خلیفہ مقتدر (۳۲۱) شمس المعالی قابوس بن وشمگیر (۳۳۰-۳۳۱) ابراہیم بن ادھم العجلی [م ۱۶۱ھ] (۳۳۲-۳۳۳) عبدالجلیل بن محمد ملقب بہ رشید (۳۳۴-۳۳۵) مہلب بن عبداللہ (۳۴۷) جمال بادہ (۳۴۸) نعمان بن امرأ القیس (۳۵۹-۳۶۰) ابوعلی شاذان وزیر (۳۶۰) یحیی بن محمد بن ہبیرۃ وزیر مقتفی (۳۶۷-۳۶۸) عماد الملک وزیر سلطان خوارزم شاہ (۳۸۹) حضرت طالوتؑ (۳۹۸) نظام الملک حسن بن علی بن اسحاق [م ۴۸۵ھ] (۴۱۱-۴۱۳) ابوالفتح محمد بن سام ملقب بہ غیاث الدین (۴۳۰) ابوالمظفر محمد بن سام ملقب بہ شہاب الدین (۴۳۰-۴۳۱) وزیر ابونصر کندری [م ۴۵۶ھ] (۴۴۷) اور شہاب الدین خیوقی کے تراجم شامل ہیں (۵۲۹)

متفرق شخصیات

مذکورہ بالا شخصیات کے علاوہ متعدد ایسی شخصیات کے تراجم یا سوانح بھی مصنف نے بیان کیے ہیں جن کی شہرت کے اسباب دینی یا اخلاقی نہیں تھے بلکہ کچھ دوسرے تھے، ان میں سے بعض کا تعلق اسلام سے کسی قسم کا نہ تھا، ایسی شخصیات میں عبداللہ بن نامر سید شہداء نجران (۱۲۶-۱۲۷) مسیلمہ کذاب (۱۳۴-

-۱۳۶) ابوالحسن قرمطی جنابی (۱۸۰) ذہانت وذکاوت کے لیے مشہور ایاس بن معاویہ (۱۹۲) شجاعت وبہادری کے لیے مشہور رستم شدید (۲۰۲) غناء وموسیقی کا ماہر بلہبد (۲۲۵) صنعتکاری وہنرمندی کے لیے مشہور شبدیز، مشہور افسانوی شخصیت فرہاد (۲۳۵) بشر مریسی معتزلی (۲۶۲-۲۶۳) حسن صباح (۳۰۱-۳۰۲) مکروہ آواز والامغنی برقعیدی (۳۰۷) مشہور خطّاط علی بن ہلال خطّاط معروف بہ ابن بواب [م ۴۲۳ھ] (۳۲۶-۳۲۷) سعد مغنی (۳۸۹) رتک پہلوان (۳۸۹) صفی کانون شطرنجی (۳۸۹) مجوسیوں کے پیغمبر زرادشت (۳۹۹-۴۰۰) ہشام بن حکم معتزلی (۴۲۱) یحییٰ بن معمر (۴۲۱-۴۲۲) جود وسخا کے لیے مشہور جمال الدین موصلی (۴۶۲-۴۶۳) ابوالقاسم منادی (۴۷۵) بادشاہِ مصر طولون کو امر بالمعروف کی تلقین کرنے والے ابوالحسین بنان بن محمد بن حمدان حمال [م ۳۱۶ھ] (۴۷۹-۴۸۰) ابراہیم ستنبہ (۴۸۲) مناظرہ کے لیے مشہور رکن الدین عمیدی [م نحو ۶۱۰ھ] (۵۳۶-۵۳۷) جود وسخاوت کے لیے مشہور ابواسحٰق کشی (۵۵۴) اور قاضی صدرالدین کے تراجم شامل ہیں۔ (۵۶۳)

مصنف نے بعض خواتین کے تراجم بھی بیان کیے ہیں جن میں زرقا یمامہ (۱۳۳-۱۳۴) سکینہ اہبریہ [م ۵۹۰ھ] (۲۸۸) اور رحمت بنت ابراہیم ہزارا سبیہ شامل ہیں۔

ہم نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں مذکور سارے تراجم کو فن وار ذکر کردیں، تاہم اس بات کا امکان ہے کہ چند نام چھوٹ گئے ہوں یا انھیں ان کے خاص فن اور میدان کے بجائے کہیں اور جگہ دے دی گئی ہو، ساتھ ہی اس بات کی بھی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کا بیان کردہ سن وفات بھی ذکر کردیا جائے، جن اشخاص کے سن وفات مصنف نے ذکر نہیں کیے ہیں ہم نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

طریقۂ کار وخصوصیات

قزوینی نے تراجم کے سلسلہ میں جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے یا جن باتوں کا خیال رکھا ہے، ذیل میں انھیں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

کنیت، نام ونسب اور لقب کا بالعموم ذکر۔

تاریخِ ولادت بہت ہی کم بیان کرتے ہیں (۶۰، ۴۵۸) تاریخِ وفات کا ذکر

بڑی حد تک کرتے ہیں (۱۴۰-۲۳۴ ، ۴۵۸ وغیرہ) اس کے ساتھ مقام وفات (۲۵۴، ۴۶۷ وغیرہ) عمر (۲۱۹ ، ۳۱۹ وغیرہ) کا ذکر کرتے ہیں ، لیسا اوقات عمر کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن سن وفات ذکر نہیں کرتے (۳۵۰) اور کبھی سن وفات کا ذکر نہ کر کے صاحب ترجمہ کی موجودگی کسی متعین وقت تک کرتے ہیں جیسے رحمت بنت ابراہیم کے بارے میں لکھتے ہیں "بقیت الی ثمان وستین وما ئتین" (۵۶۷)

اساتذہ وتلامذہ کا ذکر

صاحب ترجمہ کے میدان خصوصی کی طرف اشارہ کے ساتھ اس کی اضافی خوبی کا ذکر۔

قزوینی کے بیان کردہ تراجم میں تقریباً ہر مسلک ومذہب کے اشخاص شامل ہیں حتیٰ کہ ملحد اور مدعیان نبوت کے تراجم بھی مذکور ہیں (۲۱۱، ۲۶۲، ۲۹۷ اور ۳۲۶ وغیرہ)

صاحب ترجمہ کے ابتدائی دور کے حالات کا ذکر جیسے مشہور زاہد ابراہیم بن ادہم عجلی کے متعلق یہ بتاتے ہیں کہ وہ بلخ کے بادشاہ تھے۔ (۳۳۲)

صاحب ترجمہ سے اپنی ملاقات کا ذکر۔ (۳۲۶-۳۵۲)

صاحب ترجمہ کا پورا نام ذکر کیے بغیر نام کے اس حصہ کا ذکر جس سے وہ مشہور رہے جیسے الملل والنحل کے مصنف کا ذکر صرف شہرستانی سے کیا ہے (۲۹۸)

بعض تراجم کے صرف نام پر اکتفا کرتے ہیں اور ان کے متعلق کوئی تفصیل فراہم نہیں کرتے جیسے ابوالقاسم منادی (۴۷۵)

نسبت کا ذکر (۲۵۳) اصل کا ذکر جیسے امام ابوعبداللہ احمد بن حنبل کے متعلق لکھتے ہیں ینسب الی بغداد، کان اصلہ من مرو (۳۱۸)

وجہ تسمیہ کا ذکر جیسے زمخشری کی جاراللہ کی وجہ تسمیہ "جاور بمکۃ مدۃ" نقل کی ہے (۵۳۲)

عادات وخصائل کا ذکر جیسے بیہقی کے متعلق لکھتے ہیں "کان علی سیرۃ علماء السلف قانعًا من الدنیا بالقلیل الذی لابدّ منہ (۳۳۹)

صاحب ترجمہ کی بنیادی صفت کا ذکر جیسے بغوی کے متعلق "الإمام العالم البارع الورع محی السنۃ" اور قابوس کے متعلق "کان ملکًا فاضلًا وادیبًا" نقل کرتے

ہیں (۳۳۰)۔

تصانیف، ان کی خصوصیات، اور طرزِ تصنیف کا ذکر (۱۴۸، ۲۱۲، ۳۵۱، ۵۳۹ وغیرہ)

معاصرین کا ذکر جیسے کان (البغوی) معاصر الامام حجۃ الاسلام ابی حامد الغزالی والامام فخر الاسلام ابی المحاسن الرویانی (۳۳۰)

بعض مشہور شخصیات کے تراجم بہت ہی مختصر ہیں جیسے ابو الفرج اصبہانی (۲۹۷) حسن بصری (۳۱۱) طبری (۴۰۵) وغیرہ۔ شائد اس اختصار کی وجہ ان کی شہرت ہی ہو کہ مصنف نے ان کے متعلق زیادہ تفصیلات فراہم کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔

تراجم کا دائرہ صرف عربی علوم وفنون سے متعلق شخصیات تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں فارسی زبان کے شعراء وادباء جیسے فردوسی، انوری اور سنائی وغیرہ شامل ہیں۔

تراجم کے دوران ضمنی معلومات فراہم کرتے ہیں جیسے الملک المعظم کان فقیہا حنفیا (۵۲۷) مکی نور الدین محمد بن خالد الجیلی وکان من الابدال (۵۶۲) اور ابراہیم ستنبہ کے ترجمہ کے درمیان نقل کرتے ہیں بشمول صاحب ترجمہ ابراہیم نامی چار اشخاص ہیں جن کے واسطے سے اللہ کی شفاعت چاہی جاتی تھی (۱۲۳)

بعض مقامات کا ذکر کرکے اس کے متعین مشاہیر کے ذکر کے بجائے یہ بتاتے ہیں کہ وہاں اس فن کے متعدد ماہرین پائے جاتے ہیں جیسے واسط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ینسب الیہا جماعات من القرّاء" (۴۷۹) اور کبھی کسی مقام کے علماء وفضلاء کا مجموعی ذکر کرتے ہیں جیسے "ینسب الیہا جماعۃ ما کان لہم نظیر فی وقتہم مثل عماد الملک"..... (۳۸۹) اسی طرح مکہ کی طرف مہاجرین کی عمومی نسبت ذکر کرتے ہوئے عشرہ مبشرہ کے نام بیان کیے ہیں۔[۱۲۱]

بعض مشترک تراجم جیسے بنو الاثیر کے تحت مشہور مورخ ابن اثیر اور ان کے دیگر بھائیوں کا ذکر بجائے الگ الگ کرنے کے ان سب کی علمی فضیلت ایک ساتھ بیان کی ہے (۳۵۲)

بسا اوقات مجموعی حیثیت سے تراجم نقل کرتے ہیں جیسے فارس کے تحت لکھتے ہیں "زعم الفرس أنّ فیہم عشرۃ انفس لم یوجد فی شی من الاصناف مثلہم ولا فی الفرس ایضاً" اس ضمن میں انھوں نے مشہور افسانوی شخصیت فرہاد

کا بھی ذکر کیا ہے (۲۳۳-۲۳۵)

تراجم پر مجموعی حیثیت سے بسا اوقات تبصرہ کرتے ہیں جیسے فلاسفۂ یونان کے تراجم ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "هولاء فضلاء الناس ماتوا أسوأ ميتة، لتعلموا انه هو القاهر فوق عباده" (۵۷۴) بلاد دیلم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "منهم ملوك آل بويه وكانوا كلهم فضلاء وأدباء" (۳۳۰)

رستم پہلوان کا ترجمہ دو جگہوں صـ۲۰۲ اور صـ۲۳۴ پر ہے لیکن یہ ایک استثنائی مثال ہے ایک ماہر کاریگر شبدیز کے ترجمہ (صـ۲۳۵) میں لکھا ہے کہ اس کا ترجمہ اقلیم رابع قرمیسین کے تحت کیا جائے گا، لیکن ذکر نہیں کیا ہے۔

بسا اوقات غیر متعین ترجمہ نقل کرتے ہیں جیسے "ساباط" کے ذکر میں لکھتے ہیں اس کی جانب ایسا حجام منسوب کیا جاتا ہے کہ جب اس کے پاس کوئی گاہک نہیں آتا تھا تو وہ اپنی ماں کی حجامت بنا دیتا تھا (۳۸۵)

مذکورہ بالا خصوصیات کا اندازہ اس کتاب کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قزوینی کی مذکورہ کتاب فن تراجم کا ایک اہم مصدر و ماخذ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تراجم کو یکجا کر دیا جائے تاکہ ان سے استفادہ آسانی سے ہو سکے اور اس کا فائدہ یہ بھی حاصل ہوگا کہ فن تراجم کی مختلف اصناف میں ایک مستقل صنف کا اضافہ ہو جائے گا۔ اسلامی علوم سے تعلق رکھنے والی بہت سی اہم کتابیں ایسی ہیں جن کے بین السطور متعدد اشخاص کے تراجم بکھرے ہوئے ہیں جن کی تعداد بسا اوقات ایک ایک کتاب میں ہزار سے تجاوز کر جاتی ہے۔

حواشی و تعلیقات

۱؎ مصنف کے متعلق مصادر میں بہت ہی کم معلومات ملتی ہیں۔ ان کی پیدائش تقریباً ۶۰۰ھ میں قزوین میں ہوئی۔ خاندانی لحاظ سے عرب تھے لیکن ان کے آباء و اجداد نے ایران میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ وہاں سے دمشق چلے گئے جہاں ان کی ملاقات مشہور صوفی ابن عربی سے ہوئی۔ انھیں واسط اور حلہ کا قاضی بھی مقرر کیا گیا تھا۔ ۶۸۲ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

انھوں نے احوال کائنات اور جغرافیہ سے متعلق دو کتابیں، عجائب المخلوقات اور "آثار البلاد" بطور

یادگار چھوڑی ہیں۔

۲؎ دائرۃ المعارف الاسلامیہ (اردو) لاہور ۱۹۷۸ء (طبع اول) بذیل مادہ "قزوینی" ۱۶/۲، ص ۱۲۵

۳؎ اس کتاب کے دو نسخے الگ الگ عناوین سے پائے جاتے ہیں۔ قدیم تر نسخے کا نام "عجائب البلدان اور بعد کے نسخے کا نام "آثار البلاد واخبار العباد" ہے موخر الذکر عنوان سے یہ کتاب دار صادر بیروت سے ۱۹۶۰ میں شائع ہوئی ہے۔ یہی نسخہ ہمارے پیش نظر ہے۔

۴؎ تراجم کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب نہ کر کے مصنف کی ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے۔ قوسین میں وہ صفحہ نمبر ذکر کیا گیا ہے جہاں پر وہ ترجمہ موجود ہے۔

غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق

مولانا سید جلال الدین عمری

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہئیں؟ یہ آج کا ایک اہم اور زندہ موضوع ہے۔ کیا اسلام میں مذہبی رواداری، تحمل و برداشت اور توسع نہیں پایا جاتا؟ اسلام کے نزدیک غیر مسلموں سے خاندانی، معاشرتی، سماجی، کاروباری اور ازدواجی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ اسلامی ریاست کی بنیادیں کیا ہیں؟ اس میں ذمیوں کو کیا حقوق حاصل ہیں؟ اسلامی ریاست کے بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ اور غیر مسلموں سے عدم تعلق کے حکم کا صحیح پس منظر کیا ہے؟ یہ چند ایسے اہم مسائل ہیں جن کا آج کا جدید ذہن اطمینان بخش جواب چاہتا ہے۔

ہندوستان کے پس منظر میں غیر مسلموں سے تعلقات کے موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی مفصل کتاب، دعوت و تبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کی ایک اہم ضرورت۔

آفسٹ کی حسین طباعت، عمدہ کاغذ، خوبصورت جلد، صفحات: ۳۲۸، قیمت ۱۰۰ روپے

ملنے کے پتے: ۱۔ مکتبہ تحقیق و تصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ
۲۔ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی ۲۵

بحث ونظر

حالتِ نشہ کی طلاق

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی

شریعت وقانون کا مخاطب عقل مند اور باشعور انسان ہی ہوتا ہے، شعور وآگہی سے محروم شخص احکام شرعیہ کا مخاطب نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ وہ عقل سے محروم ہونے کی وجہ سے حیوانات کے زمرے میں آجاتا ہے۔ شراب نوشی کی وجہ سے بھی انسان وقتی طور پر ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ شراب پینے والا اپنے ارادہ واختیار سے ایک ایسی چیز کو استعمال کرکے پاگل بنا ہے جس کا استعمال شرعًا ممنوع ہے۔ تو کیا زوالِ عقل کو دیکھتے ہوئے ایسے شخص کو پاگل کے زمرے میں رکھ کر حالتِ نشہ تک غیر مکلف سمجھا جائے اور اس حالت میں اس کی طلاق کو واقع نہ قرار دیا جائے، یا ارادہ واختیار ہوتے ہوئے ممنوع چیز کو استعمال کرنے کی وجہ سے بطور سزا اس کی طلاق کو واقع قرار دیا جائے؛ بعض فقہاء کے پیش نظر پہلی بات ہے جس کی وجہ سے وہ حالتِ نشہ کی طلاق کو واقع قرار نہیں دیتے ہیں، اس کے برخلاف بعض دوسرے فقہاء بطور سزا اس کی طلاق کو نافذ قرار دیتے ہیں۔

اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ نشہ کی حقیقت کیا ہے؟ اور کس کیفیت پر نشہ کا اطلاق ہوگا۔؟

نشہ کی حقیقت

کس طرح کی کیفیت کو نشہ کہا جائے گا؛ اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ ایسا کیف ووجد کہ اس کی وجہ سے انسان زمین وآسمان میں فرق نہ کرسکے، نشہ کہلائے گا۔ امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، ابویوسفؒ، اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ عقل پر سرور کا

کا اس درجہ غلبہ ہو جائے کہ بے معنی بات کرنے لگے تو اس کیفیت کو نشہ کہا جائے گا عام طور پر فقہاء حنفیہ نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے اور اسی پر فتویٰ ہے[1] کیونکہ قرآن حکیم نے نشہ ختم ہونے کی علامت یہی بتلائی کہ اس میں بات سمجھنے کی صلاحیت آجائے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بات سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جائے تو اسے نشہ کہا جائے گا۔ فرمان خداوندی ہے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا	اے ایمان والو! حالت نشہ میں نماز
تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ	کے پاس مت جاؤ۔ یہاں تک کہ تم سمجھنے
سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ (النساء:۴۳)	لگو کہ منہ سے کیا کہتے ہو۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ جس پر شراب پینے کا الزام ہے اس سے قرآن پڑھنے کے لیے کہو یا اس کی چادر کو دوسری چادروں میں ڈال دو اگر وہ قرآن پڑھ لیتا ہے یا اپنی چادر پہچان لیتا ہے تو اسے چھوڑ دو اور اگر ایسا نہیں کر پاتا ہے تو اس پر حد جاری کرو[2] اسی طرح حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ جب شرابی نشہ میں آتا ہے تو مہمل بات کرنے لگتا ہے[3]

فقہاء کے اقوال

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ نشہ آور شی کے بغیر عقل زائل ہو جائے تو اس حالت کی طلاق واقع نہیں ہوگی جیسے دوا، یا کسی جائز پھل کے شربت پینے کی وجہ سے نشہ طاری ہو جائے تو طلاق واقع نہیں ہوگی، ایسے ہی لاعلمی اور انجانے میں شراب یا کوئی دوسری نشہ آور چیز استعمال کر لینے کی وجہ سے عقل زائل ہو جائے تو بھی طلاق واقع نہیں ہوگی، یہی حکم اس وقت بھی ہے جب کسی کو زبردستی شراب پلادی گئی ہو[4] لیکن اگر کوئی شخص بالقصد اور بے ضرورت نشہ آور چیز

---

[1] ردالمحتار : ۴/۴۴۴

[2] مصنف عبدالرزاق : ۹/۲۲۹

[3] السنن الکبریٰ للبیہقی : ۸/۳۲۰ [4] المغنی : ۱۰/۳۷۵ مسئلہ ۱۲۵۲

پی لیتا یا کھالیتا ہے[۱] تو اس کی طلاق کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ صحابہ میں حضرات عمرؓ، علیؓ، معاویہؓ، ابن عباسؓ اور تابعین میں سعید بن المسیبؒ عطاؒ، مجاہدؒ، حسنؒ بصریؒ، ابن سیرینؒ، شعبیؒ اور نخعیؒ کے نزدیک ایسے شخص کی طلاق واقع ہو جائے گی۔ امام ابوحنیفہؒ، مالکؒ، ثوریؒ اور اوزاعیؒ کا بھی یہی رجحان ہے، امام شافعیؒ کا ایک قول یہی ہے اور ابن حجر عسقلانیؒ کے بقول شافعی فقہاء نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے[۲] امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ بھی اسی کے قائل ہیں اور امام احمدؒ سے بھی ایک رائے اسی کے مطابق منقول ہے، حنبلی فقہاء میں ابوبکر خلالؒ اور قاضیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

حضرت عثمانؓ، عمر بن عبدالعزیزؒ، قاسمؒ، طاؤسؒ، ربیعہؒ اور یحییٰؒ انصاری کے نزدیک حالتِ نشہ میں طلاق واقع نہ ہوگی، مشہور محدث اور فقیہ امام لیث بن سعد مصریؒ اور اسحاق بن راہویہؒ کا یہی مسلک ہے اور امام شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ سے ایک قول اسی کے مطابق منقول ہے، جیسے حنبلی فقیہ ابوبکر بن عبدالعزیزؒ نے ترجیح دی ہے۔ داؤد ظاہریؒ، ابن حزمؒ اور علامہ ابن قیمؒ کا یہی رجحان ہے۔ حنفی فقہاء میں امام طحاویؒ اور ابوالحسن کرخیؒ اور شافعی علماء میں امام شافعیؒ کے مشہور و ممتاز شاگرد امام مزنیؒ اسی کے قائل ہیں[۳]

قائلین کے دلائل

جو حضرات حالتِ نشہ کی طلاق کو درست قرار دیتے ہیں ان کے دلائل یہ ہیں:۔

۱۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

کل الطلاق جائز الاطلاق — ہر شخص کی طلاق درست ہے سوائے

---

[۱] شراب ہی کے حکم میں افیون اور بھنگ بھی ہے، دیکھئے رد المحتار: ۴/۴۴۵-۴۴۶

[۲] فتح الباری: ۹/۳۹۱

[۳] دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ: ۵/۳۷، ۳۹، المغنی ۱۰/۳۴۶، ۳۴۷، زاد المعاد ۵/۲۱۰-۲۱۱، فتح الباری ۹/۳۹۱۔

المعتوہ المغلوب علی عقلہ[1] مغلوب العقل آدمی کے۔

اس حدیث میں ہر مکلف انسان کی طلاق کو واقع قرار دیا گیا ہے، صرف پاگل کا استثناء کیا گیا ہے، لہٰذا اس کے عموم میں نشہ کی طلاق بھی شامل ہوگی۔

۲۔ نقل کیا جاتا ہے کہ ایک عورت چھری لے کر اپنے شوہر کے سینے پر سوار ہوگئی اور کہا کہ طلاق دیدو ورنہ مار ڈالوں گی۔ شوہر نے جبر اور دباؤ کی وجہ سے مجبور ہو کر اسے طلاق دیدی، بعد میں معاملہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپؐ نے فرمایا لا قیلولۃ فی الطلاق (طلاق کے معاملہ کو واپس نہیں لیا جا سکتا ہے)[2]

۳۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ثلاث جدّھن جد	تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی حقیقت
وھزلھن جدّ: الطلاق و	تو حقیقت ہے ہی، مذاق بھی حقیقت
النکاح والرجعۃ	ہے۔ وہ ہیں: نکاح، طلاق اور رجعت۔

امام ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ وغیرہ نے اس کی روایت کی ہے۔ اس کے راوی قابلِ اعتماد ہیں، صرف ایک راوی عبدالرحمٰن بن حبیب پر بعض لوگوں نے کلام کیا ہے، اس لیے حدیث ضعیف ہے، لیکن چونکہ اس طرح کی حدیث بعض دیگر راویوں نیز متعدد صحابہ کرام سے منقول ہے، گرچہ ان کی سندوں میں بھی کچھ ضعف ہے، اس لیے حدیث درجۂ حسن میں آجاتی ہے۔ اسی کے پیش نظر امام ترمذیؒ نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے[3]

اس روایت میں کہا گیا ہے کہ مذاق میں بھی طلاق ہو جاتی ہے حالانکہ مذاق میں

---

[1] سنن ترمذی، ابواب الطلاق، باب ماجاء فی طلاق المعتوہ، امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ حدیث عطاء بن عجلان کے واسطے سے ہم کو پہونچی ہے اور وہ "ذاہب الحدیث" ہے، امام ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ "وہو ضعیف جدا" اور ابن معین اور فلاس وغیرہ نے اسے جھوٹا قرار دیا ہے۔ البتہ حضرت علی کے قول کی حیثیت سے یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ صحیح ہے "کل الطلاق جائز الا الطلاق المعتوہ" دیکھئے ارواء الغلیل ۷/۱۱۰ [2] سنن سعید بن منصور: ۱/۲۷۵

[3] دیکھئے نصب الرایہ: ۳/۲۹۴، نیز ارواء الغلیل ۶/۲۲۴، ۲۲۷

طلاق دینے والا طلاق کا لفظ بولتا ہے مگر حقیقی مفہوم مراد نہیں لیتا ہے۔ یہی صورت حالتِ نشہ کے طلاق کی ہے کہ وہ طلاق کا تلفظ کرتا ہے مگر اس کا ارادہ نہیں کرتا ہے۔

۴۔ شراب کی وجہ سے مدہوش کو حد قذف کے مسئلے میں صحابہ کرام نے باشعور کی طرح قرار دیا اور اسی بنیاد پر اتفاق رائے سے شرابی کو اسّی کوڑے لگانے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ ابن وبرہ کلبی سے روایت ہے کہ حضرت خالدؓ نے انھیں حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا، مسجد میں ان سے ملاقات ہوئی، اس وقت ان کے پاس حضرات عثمان، علی عبدالرحمٰن، طلحہ اور حضرت زبیر وغیرہ (رضی اللہ عنہم) تشریف فرما تھے، میں نے ان سے کہا کہ حضرت خالدؓ نے کہلا بھیجا ہے کہ "شراب کی سزا کو معمولی اور ہلکی سمجھ کر بکثرت شراب پی رہے ہیں، حضرت عمرؓ نے کہا کہ یہ لوگ تمہارے سامنے موجود ہیں ان سے پوچھو کہ روک تھام کی کیا تدبیر کی جائے حضرت علیؓ نے فرمایا نراہ اذا سکر هذی و اذا هذی افتری وعلی المفتری ثمانون (میرا خیال ہے کہ شراب پی کر آدمی مہمل باتیں بکنے لگتا ہے اور اس میں کسی پر تہمت بھی لگا دیتا ہے اور تہمت لگانے کی سزا اسّی کوڑے ہیں) حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ انھوں نے جو سزا تجویز کی ہے اپنے ساتھی کو اس کی اطلاع کر دو۔"

امام دارقطنیؒ نے اس کی روایت کی ہے[1] اور ان کے واسطے سے علامہ بیہقیؒ نے "سننِ کبریٰ" میں نقل کیا ہے[2]۔ حدیث کی سند عمدہ ہے، اس کے راوی قابلِ اعتماد ہیں۔ صرف ایک راوی ابو وبرہ کلبی کے متعلق شیخ البانیؒ کہتے ہیں کہ مجھے ان کے متعلق معلوم نہیں ہے[3]۔ لیکن اس طرح کی روایت حضرت عکرمہ کے حوالے سے امام نسائیؒ، عبدالرزاقؒ، اور امام طحاویؒ وغیرہ نے صحیح سند کے ساتھ نقل کی ہے، اس لیے لائقِ حجت ہے[4]۔

---

[1] سنن دارقطنی: ۳/۳۵۴

[2] السنن الکبریٰ: ۸/۳۲۰

[3] الارواء: ۷/۱۱۱

[4] مصنّف عبدالرزاق: ۷/۳۷۸ حدیث ۱۳۵۴۲، السنن الکبریٰ ۸/۳۲۱، اعلاء السنن ۱۱/۶۴۰

۵۔ ایک شخص نے حالتِ نشہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی، معاملہ حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ انھوں نے چار عورتوں کی گواہی کی روشنی میں طلاق کو واقع قرار دیا، ابن ابی شیبہؒ[1] اور بیہقیؒ[2] وغیرہ نے اس کی روایت کی ہے اور اس کے راوی ثقہ اور قابلِ اعتماد ہیں[3]۔

۶۔ حضرت علی کا قول فیصل ہے کہ کل طلاق جائز الا طلاق المعتوہ (پاگل کے علاوہ ہر شخص کی طلاق درست ہے)۔

امام عبدالرزاقؒ[4] اور بیہقیؒ[5] وغیرہ نے اس کی روایت کی ہے، امام بخاری نے تعلیقاً اسے نقل کیا ہے[6] اور سند کی حیثیت سے روایت بالکل بے غبار ہے۔ اس کے تمام راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں[7]۔

۷۔ حضرت سعید بن المسیبؒ سے منقول ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حالتِ نشہ کی طلاق کو واقع قرار دیا (اجاز طلاق السکران)[8]

رجا بن حیوۃ کہتے ہیں کہ عبدالملک بن مروان نے حضرت معاویہؓ کی ایک تحریر ہمارے سامنے پڑھی جس میں لکھا ہوا تھا کہ ان کل احد طلق امرأتہ جائز الا لمجنون (جو بھی اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو اس کی طلاق درست ہے سوائے

---

[1] مصنّف ابن ابی شیبہ : ۵/۳۸

[2] سنن کبریٰ ۷/۳۵۹

[3] حاشیہ زاد المعاد : ۵/۳۱۲، تحقیق شعیب ارنؤوط، عبدالقادر ارنؤوط

[4] مصنّف عبدالرزاق : ۶/۴۰۹

[5] السنن الکبریٰ : ۷/ ۳۵۹

[6] صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب الطلاق فی الاغلاق والکرہ والسکران والمجنون

[7] الاروار : ۷/۱۱۱

[8] ابن حزمؒ نے اس کی روایت کی ہے، دیکھئے المحلّٰی : ۱۰/۲۰۹ اور اس کے راوی ثقہ ہیں حاشیہ زاد المعاد ۵/۲۱۳

مجنون کے لیے[1]

۸۔ نشہ کی حالت میں بھی شرابی احکام شرعیہ کا مکلّف ہوا کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس حالت میں فوت شدہ نماز کی قضا، لازم ہے، نیز کسی کو قتل کر دے تو بدلے میں قتل اور چوری کرلے تو بطور سزا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، کسی پر بدکاری کی تہمت لگائے تو حدِ قذف لگائی جاتی ہے، حالانکہ کسی پاگل پر یہ احکام جاری نہیں ہوتے ہیں، اور جب حالتِ نشہ میں بھی احکامِ شرعیہ کا مکلف ہے تو اس کی طلاق بھی واقع ہو جائے گی۔[2]

۹۔ بے ضرورت، جان بوجھ کر برضا و رغبت نشہ کا استعمال شرعاً حرام ہے اور شریعت کی طرف سے اس پر ایک سزا مقرر ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ شراب کی وجہ سے جو اثرات پیدا ہوں ان کا بھی اعتبار کیا جائے، جیسے کہ کوئی شخص کسی کے جسم پر کوئی زخم لگا دے اور زخم سرایت کرنے کی وجہ سے جسم کا وہ حصہ بے کار ہو جائے تو وہ ماخوذ ہوگا، اور جسم کا جو حصہ ضائع ہوا ہے اس کے اعتبار سے بدلہ لیا جائے گا، مثلاً ایک انگلی کاٹ دینے کی وجہ سے پورا ہاتھ بے کار ہو جائے تو کاٹنے والے سے پورے ہاتھ کا تاوان لیا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناجائز کام سے جو اثر مرتب ہوتا ہے اس کا بھی اعتبار کیا جاتا ہے، اس کے برخلاف اگر چوری کی وجہ سے ہاتھ کاٹا گیا اور اس کی وجہ سے پورا ہاتھ بے کار ہو جائے تو کاٹنے والے پر کوئی تاوان نہیں ہے، کیونکہ ہاتھ کاٹنا اس کے لیے جائز تھا، لہٰذا سرایت کی وجہ سے اس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔[3]

مانعین کے دلائل

جو حضرات حالتِ نشہ کی طلاق کو واقع قرار نہیں دیتے ہیں ان کے دلائل یہ ہیں:۔

---

[1] سنن کبریٰ: ۷/۳۵۹، شیخ البانی نے کہا کہ اس کی سند امام بخاری و مسلم کے معیار اور شرط کے مطابق ہے۔ الارواء: ۷/۱۱۲

[2] دیکھئے المغنی: ۱۰/۳۲۷، البدائع ۳/۱۵۹ [3] حاشیہ رد المحتار: ۴/۴۶۴ تحقیق عادل احمد، علی محمد۔

۱۔ احکامِ شرعیہ کا مکلف اور پابند بنانے کا دارومدار عقل وشعور پر ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

رُفع القلم عن ثلاثة عن	تین طرح کے لوگوں پر کوئی داروگیر نہیں
النائم حتی یستیقظ وعن الصبیّ	ہے: سونے والے پر یہاں تک کہ بیدار
حتی یشبّ، وعن المعتوہ حتی	ہوجائے، بچے پر یہاں تک کہ بالغ ہوجائے،
یعقل، اخرجہ ابوداؤد وابن ماجہ و	پاگل پر یہاں تک کہ اس سے افاقہ
الترمذی وقال حدیث حسن[1]	ہوجائے۔

پاگل کی طرح شرابی بھی عقل وخرد سے عاری ہوجاتا ہے لہٰذا وہ احکامِ شرعیہ کا پابند نہیں ہے، اس کے قول کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا، اس لیے اس کی طلاق واقع نہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ماعزؓ بدکاری میں ملوث ہوجانے کے بعد خوفِ خداوندی اور خشیت کی وجہ سے بارگاہِ نبوت میں آکر اپنی غلطی کا خود ہی اعتراف اور اقرار کرتے ہیں تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: کیا تو پاگل ہے؟ تجھ پر جنون کا دورہ تو نہیں پڑتا ہے؟ انھوں نے کہا نہیں۔ فرمایا: کیا شراب پی کر آیا ہے؟ کہا نہیں، مجلس میں موجود ایک صاحب اٹھے اور جاکر دیکھا کہ منہ سے شراب کی بُو تو نہیں آرہی ہے، سونگھنے پر شراب کا کوئی اثر معلوم نہیں ہوا تو ان پر شرعی سزا نافذ کردی گئی[2]

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سوال کرنا کہ کیا تو نے شراب پی ہے؟ اس بات کی دلیل ہے کہ شرابی کے قول واقرار کا کوئی اعتبار نہیں ہے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہ دریافت کرنے کے کوئی معنی نہیں رہ جائیں گے۔

۲۔ علماء کا اتفاق ہے کہ احکامِ شرعیہ کا پابند بنانے کے لیے عقل وشعور شرط ہے اور عقل وشعور زائل ہوجانے کے بعد کوئی انسان شریعت کے احکام کا مکلّف نہیں رہتا، خواہ عقل وشعور کا زوال کسی قدرتی آفت کی وجہ سے ہو یا کسی اختیاری معصیت کی وجہ سے،

---

[1] المغنی: ۲/۵۰ مسئلہ ۱۱۹، کتاب الصلوٰۃ، امام حاکم نے کہا ہے کہ حدیث امام مسلمؒ کے معیار کے مطابق ہے، علامہ ذہبیؒ نے حاکمؒ کی تائید کی ہے۔ المستدرک ۲/۵۹

[2] صحیح بخاری، کتاب الطلاق باب الطلاق فی الاغلاق والکرہ، صحیح مسلم، کتاب الحدود باب حد الزنا۔

جیسے اگر کوئی جان بوجھ کر پاگل بننے کے ارادہ سے کسی چیز سے اپنا سر ٹکرادے اور اس کے نتیجے میں پاگل ہوجائے تو بہ اتفاق شرعی احکام کا وہ مکلف نہیں رہ جاتا ہے[1]۔ اور ایسے پاگل کی طلاق بہ اتفاق واقع نہیں ہوگی، حالانکہ وہ اختیاری معصیت کی وجہ سے پاگل بنا ہے۔

۳۔ حضرت عثمان غنیؓ سے منقول ہے کہ جنون اور حالتِ نشہ کی طلاق کا اعتبار نہیں ہے۔

امام بخاریؒ نے سند کے بغیر اس کی روایت کی ہے مگر مصنّف ابن ابی شیبہ میں یہ روایت مکمل سند کے ساتھ موجود ہے[2]۔ اور سند صحیح ہے، امام بیہقیؒ نے بھی اسے نقل کیا ہے اور اس کی سند کے متعلق علامہ البانیؒ نے کہا ہے کہ یہ امام بخاری و مسلم کے شرط کے مطابق ہے[3]۔ اس روایت کے متعلق امام احمد بن حنبلؒ کہا کرتے تھے:

حدیث عثمان ارفع شئ فیہ، وھو اصح یعنی من حدیث علیؓ	حضرت عثمانؓ کی روایت اس مسئلہ میں بلند تر روایت ہے اور حضرت علیؓ کی روایت سے اسنادی حیثیت سے زیادہ صحیح ہے۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا فتویٰ ہے کہ طلاق السکران والمستکرہ لیس بجائز۔ (حالتِ نشہ اور اکراہ کی طلاق درست نہیں ہے۔)

امام بخاریؒ نے سند کے بغیر صیغہ جزم کے ساتھ اسے نقل کیا ہے جو ان کے نزدیک صحیح ہونے کی دلیل ہے۔ ابن ابی شیبہ نے سند کے ساتھ اس کی روایت کی ہے، اس کے راوی قابلِ اعتماد ہیں[4]۔

واضح رہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بعض روایتوں میں حالتِ نشہ کی طلاق کا اعتبار منقول ہے، اور اسی کے اعتبار سے ہم نے ان کا نام قائلین کی فہرست میں لکھا ہے۔ لیکن علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ ابن عباس کی طرف اس رائے کی نسبت سند کی حیثیت سے درست نہیں ہے[5]۔

---

[1] المغنی: ۱۰/۳۴۸ [2] فتح الباری: ۹/۳۹۱ [3] ارواء الغلیل: ۷/۱۱۲
[4] المغنی: ۱۰/۳۴۷ [5] الارواء: ۷/۱۱۳ [6] حوالہ مذکور: ۷/۱۱۴

۵۔ بے خیالی یا مجبوری میں شراب پینے کی وجہ سے عقل زائل ہوجائے تو طلاق کا اعتبار نہیں کیا جاتا ہے، ایسے ہی پاگل، بے ہوش اور بچے کی طلاق بھی واقع نہیں ہوتی ہے، کیونکہ یہ عقل وخرد سے عاری ہیں، اس پر قیاس کا تقاضا ہے کہ بالقصد شراب پینے کی وجہ سے عقل زائل ہوجائے تو اس حالت میں بھی طلاق کا اعتبار نہ کیا جائے۔

دلائل کا ایک جائزہ

دونوں طرف کے دلائل دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسئلہ سے متعلق کوئی آیت اور صریح وصحیح حدیث موجود نہیں ہے، چنانچہ قائلین کی طرف سے پیش کردہ پہلی حدیث حد درجہ ضعیف ہے جس کی طرف حاشیہ میں کچھ اشارہ کیا جاچکا ہے اور اس طرح کی حدیث سے احکام میں استدلال نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ کی دوسری روایت بھی کافی ضعیف اور کمزور ہے، چنانچہ اس کے ایک راوی صفوان بن عمرو کے ضعف پر اکثر محدثین کا اتفاق ہے۔ ان کے متعلق امام بخاریؒ کا خیال ہے کہ "حدیثہ منکر لایتابع علیہ" دوسرے راوی غازی بن جبلہ پر بھی کلام کیا گیا ہے۔ تیسرے راوی "بقیہ" ہیں جن کا ضعف بڑا مشہور ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ "تدلیس" کے عادی ہیں۔[1]

تیسری حدیث اسنادی حیثیت سے درجۂ حسن میں آجاتی ہے۔ لیکن یہ اور اس سے پہلے مذکور دونوں حدیثیں اپنے موضوع پر صریح نہیں ہیں، کیونکہ ان کا تقاضا تو یہ ہے کہ جائز ذریعہ سے نشہ کی حالت میں اور پاگل کی طلاق بھی واقع ہوجائے، حالانکہ کوئی اس کا قائل نہیں ہے۔ اس لیے لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حدیث میں وہ طلاق مراد ہے جو مکلف انسان اپنے ارادہ واختیار سے انجام دے۔

چوتھی روایت اسنادی حیثیت سے بے غبار ہے۔ ابن حزمؒ کا اسے نادرست قرار دینا ان کی شدت پسندی ہے جسے کوئی حقیقت پسند قبول نہیں کرسکتا ہے، البتہ

---

[1] زادالمعاد : ۲۰۸/۵

مفہوم کے اعتبار سے اسے صریح قرار دینا مشکل ہے۔

حضرت عمرؓ اور علیؓ کا اثر بھی ثابت شدہ ہے، البتہ حضرت علیؓ کے اثر کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ پاگل کے سوا ہر شخص کی طلاق واقع ہوجاتی ہے خواہ وہ نابالغ ہی کیوں نہ ہو، حالانکہ تمام فقہاء کے نزدیک نابالغ کی طلاق کا اعتبار نہیں ہے، اس لیے اس روایت کی تاویل کرنے کی ضرورت ہوگی، علامہ ظفر احمد عثمانی نے اس کی تاویل کرتے ہوئے کہا ہے کہ "ہر طلاق" سے مراد ہر بالغ شخص کی طلاق ہے، لہٰذا نابالغ اس کے عموم میں شامل نہیں ہے[1] یہ ایک عمدہ تاویل ہے، روایت کے الفاظ میں اس کی گنجائش ہے، مگر مسئلہ یہ ہے کہ حضرت علی نابالغ کی طلاق کے قائل ہیں، ان کا یہ نقطۂ نظر بڑا مشہور ہے اور انھوں نے اپنے اسی خیال کے پس منظر میں یہ بات کہی ہے چنانچہ مکمل روایت یہ ہے:

اکتموا الصبیان النکاح	بچوں سے نکاح کو پوشیدہ رکھو، کیونکہ
فان کل طلاق جائز الا	ہر طلاق واقع ہوجاتی ہے سوائے پاگل کی
طلاق المعتوہ[2]	طلاق کے۔

اس لیے مذکورہ تاویل "تاویل القول بما لا یرضی بہ القائل" کے قبیل سے ہوگی۔

حضرت معاویہؓ کا قول سند کی حیثیت سے صحیح بھی ہے اور صریح بھی۔

رہا یہ خیال کہ شرابی حالتِ نشہ میں احکام شرعیہ کا مکلف ہوا کرتا ہے، اس وجہ سے فوت شدہ نمازوں کی قضا لازم ہے تو اس خیال سے اتفاق دشوار ہے، کیونکہ بالاتفاق احکام شرعیہ کا مکلف ہونے کے لیے "عقل" شرط ہے اور یہ شرابی میں مفقود ہے۔ اور اگر اس حالت میں بھی مکلف قرار دیا جائے تو پھر مجبوری اور لاعلمی کی وجہ سے شراب پینے والے کی طلاق کا بھی اعتبار ہونا چاہیے۔ رہا نماز کی قضاء کا مسئلہ تو بہ اتفاق سونے والے پر نماز کی قضاء ہے حالانکہ وہ اس حالت میں احکام شرعیہ کا مکلف نہیں ہوتا ہے[3]

---

[1] اعلاء السنن: ۱۱/۱۷۶ [2] معرفۃ الآثار والسنن: ۱۱/۷۷

[3] زاد المعاد: ۵/۲۱۲، فتح الباری ۹/۳۹۱

دوسرے یہ کہ حالتِ نشہ کے قول وفعل میں فرق ہونا چاہیے، کہ اس کے اقوال کا کوئی اعتبار نہ کیا جائے، کیونکہ اس سے کوئی مفسدہ پیدا نہیں ہوگا، البتہ اس کے افعال کا اعتبار ہونا چاہیے، کیونکہ افعال کے وقوع کے بعد اس کو غیر معتبر قرار دینے میں بڑا ضرر ہوگا۔ لہٰذا خرید وفروخت اور اقرارِ طلاق[1] کی طرح حالتِ نشہ کی طلاق کا بھی اعتبار نہیں ہونا چاہیے اور حالتِ نشہ کے قتل اور چوری کا اعتبار ہونا چاہیے، کیونکہ ان افعال کو لغو قرار دینے میں بڑا ضرر ہوگا، جیسا کہ بہ اتفاق مجنوں اور بچے کے قول کا اعتبار نہیں ہے، مگر فعل مثلاً قتل اور چوری کی وجہ سے تاوان واجب ہے۔ آٹھویں دلیل کے سلسلہ میں عرض ہے کہ اس اصول کے مطابق تو اگر کوئی شخص خودکشی کے ارادے سے اپنے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے، لیکن کوشش کامیاب نہ ہو اور جان تو بچ جائے مگر عقل سے ہاتھ دھو بیٹھے، یا کسی مسلمان سے لڑائی کی اور اس لڑائی میں چوٹ کی وجہ سے دماغی توازن کھو بیٹھے اور اسی پاگل پن کی حالت میں بیوی کو طلاق دے دے تو کیا اس طلاق کا اعتبار کیا جائے گا؟ مذکورہ اصول کے مطابق چونکہ ایک ناجائز کام کا اثر اور نتیجہ ہے لہٰذا اس کا اعتبار ہونا چاہیے حالانکہ کوئی اس کا قائل نہیں ہے۔

مانعین کی طرف سے حضرت ماعزؓ کی جو روایت پیش کی گئی ہے وہ صحیح تو ہے مگر صریح نہیں ہے، کیونکہ اقرارِ طلاق اور وقوعِ طلاق میں بڑا فرق ہے، ایک خبر ہے تو دوسرا انشاء۔ حضرت ماعزؓ کے واقعہ میں اقرار ہے اور مانعین بھی حالتِ نشہ کے اقرارِ طلاق کا اعتبار نہیں کرتے ہیں اور یہاں اقرارِ طلاق سے نہیں بلکہ ایقاعِ طلاق کی بحث چل رہی ہے۔

اس کے سوا جو دلائل ہیں ان تمام کا حاصل یہ ہے کہ احکامِ شرعیہ کی پابندی کے لیے عقل وشعور ہونا شرط ہے۔ یہ بڑی قوی دلیل ہے۔ اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

غرض یہ کہ موضوع سے متعلق کسی بھی فریق کے پاس صراحتاً قرآنی آیت یا صحیح اور صریح حدیث موجود نہیں ہے، بلکہ مسئلہ کا تمام تر دارومدار آثارِ صحابہ اور قیاس پر

---

[1] واضح رہے کہ جو لوگ حالتِ نشہ کی طلاق کو واقع قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک بھی حالتِ نشہ کی خرید وفروخت درست ہے نہ حالتِ نشہ کے اقرارِ طلاق کا اعتبار ہے۔

ہے، لیکن آثارِ صحابہ میں بھی اختلاف ہے۔ ایک طرف حضرت عمرؓ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے فتاوے اور فیصلے ہیں، تو دوسری طرف حضرت عثمانؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا فتویٰ اور طرزِ عمل ہے، بلکہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ نے جس وقت یہ بات کہی صحابہ میں سے کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی۔ گویا کہ اس پر ایک طرح سے اجماع ہے چنانچہ ابن المنذر کہتے ہیں:

هٰذا ثابت عن عثمان	یہ حضرت عثمانؓ سے ثابت ہے۔
ولا نعلم احدًا من	ہمارے علم میں نہیں ہے کہ صحابہ میں سے
الصحابة خالفه[1]	کسی نے اس سے اختلاف کیا ہو۔

اور جو لوگ حالتِ نشہ کی طلاق کو واقع قرار دیتے ہیں ان کے پیشِ نظر بنیادی طور پر یہ ہے کہ حالتِ نشہ کی طلاق شراب نوشی کے سدِّباب کے لیے بہت مؤثر ہے، یہ ایک طرح سے شوہر کے لیے دوہری سزا ہے۔ لہٰذا اس حالت کی طلاق کو واقع قرار دینے ہی میں مصلحت ہے۔ یہ ایک معقول اور مناسب بات ہے۔ یقیناً اس سے شراب نوشی میں کمی ہوگی، لیکن ایسے ماحول اور معاشرہ میں جہاں نکاح کے خرچ کی ذمہ داری مرد پر عائد ہوتی ہو، تلک اور جہیز کا رواج نہ ہو، مطلقہ عورتوں کے دوسرے نکاح کے لیے کوئی پیچیدگی نہ ہو، بلکہ شوہر دیدہ عورتوں کی شادی بھی کنواری عورتوں کی طرح عام ہو، یقیناً ایسے معاشرہ میں طلاق شوہر کے لیے ایک سزا ہے کیونکہ ایک کثیر مہر دے کر جس عورت کو وہ حبالۂ عقد میں لے آیا ہے اس سے محروم ہو جائے گا، نیز دوسری شادی کا مزید خرچ برداشت کرنا پڑے گا۔ لیکن ہندوستان کے پس منظر میں جہاں جہیز نہ دے سکنے کی وجہ سے لڑکیاں زندگی بھر کنواری رہ جاتی ہیں، ہندو رسم و رواج کے اثر سے طلاق یافتہ عورت سے نکاح کو معیوب سمجھا جاتا ہے، شراب نوشی پر کوئی پابندی نہیں ہے بلکہ قانوناً اس کی اجازت ہے، ایسے معاشرہ میں طلاق مرد کے بجائے عورت کے لیے سزا بن جاتی ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ مرد تو دوسرے ہی دن نئی شادی رچا لیتا ہے اور عورت زندگی بھر ناکردہ گناہ کی سزا کاٹتی رہتی ہے، اس لیے ایسے ماحول میں طلاق واقع نہ قرار دینا ہی زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ مسلّہ دلائل کے قوی یا کمزور ہونے کا نہیں ہے کیونکہ دلائل ہر ایک کے پاس ہیں اور ایسے دلائل ہیں کہ انھیں بالکل رد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ قابلِ غور بات حالات و زمانہ کی تبدیلی ہے کہ آج کے معاشرہ میں نشہ اور سکر کی حالت میں طلاق کا واقع قرار دینا تقاضائے مصلحت ہے یا نہیں؟ اس سے جو معاشرتی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں ان کا کیا علاج ہے؟

[1] المغنی: ۱/۳۴۷

ترجمہ وتلخیص

سیرت نگاری کی تاریخ پر ایک نظر

مصطفیٰ السقا ، ابراہیم الابیاری، عبدالحفیظ شلبی
مترجم :- ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

کتب سیرت میں جتنی شہرت اور مقبولیت سیرتِ ابن ہشام کو حاصل ہوئی اتنی کسی اور کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ متعدد مصنفین نے اس کی شرحیں کیں، خلاصے تیار کیے، منظوم کیا اور مختلف زبانوں میں ترجمے کیے۔ اس کے علاوہ اب تک اس کے پندرہ ایڈیشن سے زائد منظر عام پر آچکے ہیں۔ ۱۹۳۶ء (۱۳۵۶ھ) میں محی الدین عبدالحمید کا محقق ایڈیشن چار حصوں میں المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر سے شائع ہوا۔ یہی ایڈیشن دوبارہ ۱۹۷۱ء میں چھپا۔ اس کے مقدمے میں سیرت نگاری کی تاریخ پر اجمالی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصر کے مشہور محقق عبدالسلام ہارون نے تہذیب سیرۃ ابن ہشام" کے نام سے اس کی تلخیص کی۔ اس کا چوتھا ایڈیشن کویت سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا ہے۔ اس پر بھی ایک مختصر مقدمہ ہے۔

۱۹۳۶ء میں سیرتِ ابن ہشام کا ایک نفیس ایڈیشن مصطفیٰ السقا، ابراہیم الابیاری اور عبدالحفیظ شلبی کی تحقیق کے ساتھ مطبعۃ الحلبی مصر سے چار حصوں میں شائع ہوا ہے۔ چند سال قبل ۱۹۹۴ء (۱۴۱۵ھ) میں دار احیاء التراث العربی بیروت سے بھی اس کی اشاعت ہوئی ہے۔ یہ ایڈیشن زیادہ محقق ہے۔ اس پر ان محققین نے ایک بیش قیمت مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں سیرت نگاری کی تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اہم سیرت نگاران کا تعارف کرایا ہے۔ یہاں کسی قدر تلخیص کے ساتھ اس کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ ——— (ادارہ)

"مغازی" اور "سیر" کے الفاظ کا استعمال جب مطلق ہوتا ہے تو مسلم مورخین ان سے عربوں کی تاریخ کا اولین صفحہ مراد لیتے ہیں، وہ صفحہ جس میں اسلام کا قلعہ تعمیر کرنے اور

عربوں کو رسولِ خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے تلے جمع کرنے کے لیے جہاد کی تاریخ رقم ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش، آپ کے آباء و اجداد اور نبوت سے قبل آپ کی زندگی کے واقعات کا تذکرہ ہوتا ہے۔

رسالتِ محمدی کا ظہور پوری انسانیت کی تاریخ میں عام طور پر اور عربوں کی تاریخ میں خاص طور پر ایک عظیم الشان واقعہ تھا۔ اس لیے کہ عربوں کی زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں آپ کی حیاتِ طیبہ اور آپ کے لائے ہوئے دین کے گرد گردش کرتی تھی۔ وہ کہیں اکٹھا ہوتے تو آپ ہی ان کا موضوعِ گفتگو ہوتے، اور کہیں سے اٹھتے تو آپ ہی کے بارے میں منصوبے تیار کر کے اٹھتے۔ ان کی محفلوں میں چرچا ہوتا تو بس آپ کا اور ان کی فوجی ٹولیاں اور لشکر فوج کشی کے لیے روانہ ہوتے تو آپ ہی سے مقابلے کے لیے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے انھیں اسلام پر مجتمع کر دیا اور وہ سخت جاہلیت اور شدید گمراہی سے نکل کر نورِ ہدایت میں آ گئے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عرب قوم جس کی دیگر قوموں کے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی اور جو اردگرد کے لوگوں کی دست درازیوں سے محفوظ نہ تھی، زندگی کے میدانوں میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے لگی، انسانوں کو راہِ ہدایت دکھانے کا فریضہ انجام دینے لگی اور بلند ہمتی، شجاعت، ایثار، حمایتِ حق اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون اور اچھے اخلاق سے بہرہ ور ہونے میں اس کی مثال دی جانے لگی۔

یہ ہے خلاصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی سیرت کا، جنھوں نے آپ کی پیش کردہ ہدایت اور دینِ حق کا اتباع کیا، اور زندہ جاوید کارنامے انجام دے کر مجد و شرف اور عظمت و فخر کے صحیفے رقم کیے۔

پھر بعد میں آنے والے بعض قائدین میں بغض و حسد سرایت کر گیا۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کا جذبہ سرد پڑ گیا۔ امت مختلف راستوں پر چل پڑی اور ان کی دلچسپیاں جدا جدا ہو گئیں۔ اس طرح ان کی ایک نئی تاریخ مدون ہوئی۔ پھر جوں جوں امت ملکوں اور حکومتوں میں تقسیم ہوتی گئی، ان کی تاریخ بھی الگ الگ ہو گئی۔ ہر حکومت کی، اس کے نئے جغرافیہ اور دیگر حکومتوں کے ساتھ

روابط کے ضمن میں مخصوص تاریخ وجود میں آئی۔

عربوں کے نزدیک تاریخ نویسی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل عربوں کے یہاں تاریخ کے فن میں کوئی چیز نہیں تھی، سوائے جاہلیتِ اولیٰ کی چند خبروں کے جو زبانی روایات کی شکل میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی آئی تھیں اور جو ان کے درمیان عام تھیں۔ مثلاً ان کے آباؤ اجداد کے واقعات اور انساب اور ان سے متعلق مشہور ایسے قصے جن سے ان کی شجاعت، سخاوت اور وفاداری کا اظہار ہوتا تھا۔ یا خانۂ کعبہ، زمزم اور قبیلۂ جرہم کے بارے میں ان تک پہنچنے والی معلومات یا ان خانوادوں کا تذکرہ جنھیں یکے بعد دیگرے قبیلۂ قریش کی سرداری حاصل رہی، یا سدِّ آرب کے ٹوٹ جانے کا واقعہ جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں لوگ مختلف علاقوں میں منتشر ہو گئے، وغیرہ۔ ان چیزوں کے بارے میں ان کی زبانی روایات تحریری نوشتوں کا متبادل بن گئی تھیں۔ لوگ انھیں سنتے، یاد رکھتے اور دوسروں کو سناتے تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کے ظہور سے تاریخ کا ایک نیا سرچشمہ منظرِ عام پر آیا اور وہ تھا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، حیاتِ طیبہ اور اس کی سرگرمیوں (اللہ کی راہ میں جہاد، مشرکین اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ ٹکراؤ، توحید کی دعوت اور اس پر زبانی اور مسلح مخالفتوں کے اثرات وغیرہ) سے متعلق صحابہ کرام کے بیانات۔ یہ چیزیں اولاً تاریخ کا، ثانیاً سیرت کا مواد بنیں۔

خلفائے راشدین کے عہد میں تاریخِ عرب یا سیرت سے متعلق کوئی چیز مدوّن نہیں ہوئی۔ اس مدّت میں صرف قرآن کریم اور نحو کے چند قواعد کی تدوین ممکن ہو سکی تھی۔ حفاظتِ قرآن کی خواہش نے صدرِ اول کے مسلمانوں کو آمادہ کیا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور آپ کے بعد بھی، اسے ضبطِ تحریر میں لے آئیں۔ اسی طرح اسلامی ریاست کے حدود وسیع ہوئے اور عرب کا عجم سے اختلاط ہوا تو عربی زبان کو عجمی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے نحو کی تدوین عمل میں آئی۔

سیرت میں تالیف کا آغاز

حضرت معاویہؓ نے اپنے عہد میں خواہش کی کہ تاریخ کی ایک کتاب مرتّب کی جائے۔ انھوں نے صنعاء سے عَبید بن شَریہ جرہمی کو بلایا جنھوں نے ان کے لیے ملوک کے تذکرہ اور ماضی کے اہم واقعات پر مشتمل ایک کتاب تیار کی۔ اس کے بعد متعدّد اہلِ علم نے علمِ تاریخ کی جانب ایک مخصوص پہلو سے توجہ کی اور وہ پہلو ہے سیرتِ رسول کا۔ انھیں حضرت عمر بن عبدالعزیز (م ۱۰۱ھ) کے عہد تک، قرآن و حدیث کے باہم اختلاط کے اندیشے سے، احادیث کی تدوین سے روک دیا گیا تھا[1] اس لیے انھیں آں حضرت کی سیرت نگاری کے ذریعے ایک ایسی چیز ہاتھ آئی جس کے ذریعہ وہ آپؐ سے اپنے قلبی تعلق اور آپ کے آثار کو زندہ جاوید بنانے کی خواہش کا اظہار کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے جو سب کے سب محدّث تھے، سیرت پر کتابیں تالیف کیں۔ سطورِ ذیل میں ان میں سے چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

عروہ بن الزبیر بن العوّام

فقیہ، محدّث، ان کے باپ حضرت زبیرؓ حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے اور حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ان کی ماں حضرت اسماءؓ حضرت ابوبکرؓ کی صاحب زادی تھیں۔ اس عالی نسبی کی بنا پر انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے واقعات اور احادیث روایت کی ہیں اور صدرِ اسلام کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ اصحابِ سیر میں سے ابنِ اسحاق، واقدی اور طبری نے ان سے کثرت سے روایات لی ہیں۔

---

[1] احادیث کو لکھنے کی ممانعت عہدِ نبوی کے ابتدائی دور میں تھی۔ بعد میں خود اللہ کے رسولؐ نے اس کی اجازت دے دی تھی اور متعدّد صحابہ نے احادیث کے مجموعے تیار کر لیے تھے۔ البتہ تدوینِ حدیث کا حکم سرکاری طور پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عہد میں دیا۔ اس موضوع پر تفصیل کے لیے دیکھئے السنۃ قبل التدوین۔ د۔ محمد عجّاج خطیب اور صحیفۂ ہمام بن منبہؒ پر "حدیثِ نبوی کی تدوین و حفاظت" کے عنوان سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا بیش قیمت دیباچہ۔ طبع جدید کراچی ۱۹۹۸ء (مترجم)

خاص طور سے ہجرتِ حبشہ، ہجرتِ مدینہ اور غزوۂ بدر کے ضمن میں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عروہ کی وفات ۹۲ھ میں ہوئی۔

ابان بن عثمان بن عفّان المدنی متوفی ۱۰۵ھ

انھوں نے سیرت میں متعدد کتابیں تالیف کیں جن میں حیاتِ رسول کے واقعات جمع کیے۔

وہب بن منبّہ الیمنی متوفی ۱۱۰ھ

انھوں نے مغازی پر ایک کتاب تالیف کی۔ اس کتاب کا کچھ حصہ ہیڈلبرگ (جرمنی) میں محفوظ ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے حضرات ہیں جنھیں سیرت نگاری کا شرف حاصل ہے۔ ان میں سے بعض دوسری صدی ہجری کے ربع اول کے ختم ہونے ہوتے وفات پا گئے مثلاً شرحبیل بن سعد (م ۱۲۳ھ) ابن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ) عاصم بن عمر بن قتادہ (م ۱۲۰ھ) اور بعض کی وفات اس کے چند سال بعد ہوئی مثلاً عبداللہ بن ابی بکر بن حزم (م ۱۳۵ھ) مذکورہ بالا چاروں حضرات نے مغازی اور ان کے متعلقات پر بڑا ذخیرہ فراہم کیا ہے۔

کچھ سیرت نگار دوسری صدی ہجری کے وسط یا اس کے چند سال بعد تک زندہ رہے۔ مثلاً موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۱ھ) معمر بن راشد (م ۱۵۰ھ) اور امام اہلِ السیر محمد بن اسحاق (م ۱۵۲ھ)۔

دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی کے اوائل میں بھی بعض اہلِ سیر کو شہرت ملی۔ مثلاً زیاد البکّائی (م ۱۸۳ھ) واقدی صاحب المغازی (م ۲۰۷ھ) محمد ابن سعد مؤلف الطبقات الکبریٰ (م ۲۳۰ھ) اور ابن ہشام (م ۲۱۸ھ) ابن ہشام نے سیرتِ ابن اسحاق کی تہذیب و تنقیح کا کام کیا۔ چنانچہ وہ انہی کے نام سے مشہور ہوئی۔

سیرت نگاری کے مختلف ادوار

سیرت پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ آج تک منقطع نہیں ہوا ہے۔ لیکن یہ موضوع فی نفسہ ایسا نہیں جو تجربات پر مبنی یا دلیل و برہان پر قائم ہو اور اس کی حیثیت ان سائنسی نظریات کی سی نہیں جن میں اہل علم زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ تجدید یا تبدیلی کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ یہ ایسا علم ہے جس کی بنیاد نقل و روایت پر ہے۔

اس فن سے اشتغال رکھنے والے ابتداء میں محدثین اور راویانِ حدیث و سیرت تھے۔ بعد کے لوگوں نے جمع و تبویب کا کام کیا۔ پھر نقد و تعلیق کا مرحلہ آیا، جیسا کہ ابن ہشام نے سیرت ابن اسحاق میں کیا ہے۔

اس طرح یہ سرمایہ متاخرین تک اس شکل میں پہنچا کہ اس کے جوہر میں کسی نئی چیز کا اضافہ ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ جو کچھ محنت کی گئی وہ بس ظاہری شکل و صورت میں تھی۔ اس عہد کے سیرت نگاروں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک گروہ نے متقدمین اصحابِ سیر کی کتابوں کے زیرِ سایہ کام کیا۔ ان کی شرحیں لکھیں، خلاصے تیار کیے یا انھیں منظوم کیا، تاکہ انھیں آسانی سے یاد کیا جا سکے۔ دوسرے گروہ نے خود کو طبع زاد مصنفین کی حیثیت سے پیش کیا۔ انھوں نے قدیم کتب سیرت اکٹھا کیں اور ان کی روشنی میں ایسی کتابیں تالیف کیں جو بظاہر تو ان کی اپنی معلوم ہوتی تھیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہ مواد ان سے پہلے کے متعدد مصنفین پیش کر چکے تھے۔

موخر الذکر گروہ میں سے درج ذیل اصحابِ سیر قابلِ ذکر ہیں:

ابن فارس اللغوی[1] ۳۹۵ھ میں رے میں وفات پائی۔

محمد بن علی بن یوسف الشافعی الشامی (م ۶۰۰ھ)

ابن ابی طیّ یحییٰ بن حمید (م ۶۳۰ھ)

ظہیر الدین علی بن محمد گازرونی (م ۶۹۷ھ)

علاء الدین علی بن محمد الخلاطی الحنفی (م ۷۰۸ھ)

---

[1] دار الکتب المصریہ قاہرہ میں سیرتِ ابن فارس کے دو مخطوطے موجود ہیں۔ دیکھئے نمبر ۴۹۶، ۴۹۷ تاریخ۔

ابن سیّد الناس البصری الشافعی[1] (پ ۶۷۱ھ، م ۷۳۴ھ)
شہاب الدین الرُّعینی الغرناطی[2] (م ۷۷۹ھ)
ابو عبداللہ محمد بن احمد بن علی بن جابر الاندلسی[3] (م ۷۸۰ھ)
محمد بن یوسف الصالحی (م ۹۴۲ھ) صاحب السیرۃ الشامیہ[4]
علی بن برہان الدین (پ ۹۷۵ھ، م ۱۰۴۴ھ) صاحب السیرۃ الحلبیہ[5]
اول الذکر گروہ میں سے درج ذیل سیرت نگاروں کو شہرت ملی۔

سُہیلی (م ۵۸۱ھ)
ابوذر خُشنی (م ۶۰۴ھ)
} دونوں نے سیرتِ ابن ہشام کی شرح کی ہے۔

قطب الدین عبدالکریم الحمامیلی[6] (م ۷۳۵ھ) جنھوں نے سیرتِ محمد بن علی بن یوسف کی شرح کی ہے۔

قاسم بن قطلوبغا، جنھوں نے سیرت مغلطائی[7] کی تلخیص کی ہے۔

---

[1] ابن سیدالناس کی کتاب کا نام "عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر" ہے۔ دارالکتب المصریہ میں اس کے کئی مخطوطے ہیں۔

[2] سیرت پران کا کتابچہ "رسالۃ فی السیرۃ والمولد النبوی" کے نام سے ہے جو دارالکتب المصریہ میں بصورت مخطوطہ موجود ہے۔ نمبر ۴۹۴ مجامیع تاریخ۔

[3] ان کی تصنیف کا نام بھی "رسالۃ فی السیرۃ والمولد النبوی" ہے اور وہ مذکورہ بالا رسالہ (حاشیہ نمبر ۲) کے ساتھ ایک مجموعہ میں دارالکتب المصریہ میں محفوظ ہے۔

[4] اس کا نام "سبل الہدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد.... الخ" ہے۔ دارالکتب المصریہ میں اس کے دو مخطوطے ہیں۔ ایک مخطوطہ چار اجزاء پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے مخطوطے میں دو صرف اجزاء (سوم اور پنجم) ہیں۔

[5] اس کتاب کا نام "انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون" ہے۔ دارالکتب المصریہ میں اس کے ایک سے زائد مخطوطے ہیں۔

[6] اس کتاب کا نام "المورد العذب الہنی فی الکلام علی سیرۃ عبدالغنی" ہے۔

[7] حافظ علاءالدین مغلطائی کی ولادت ۶۸۹ھ اور وفات ۷۶۲ھ میں ہوئی۔ سیرت و تاریخ کے موضوع پر ان کی کتاب کا نام ہے: "الاشارۃ الی سیرۃ المصطفیٰ وآثار من بعدہ من الخلفاء" اس میں انھوں نے عباسی =

عزالدین ابن عمر الکنانی۔
ابوالحسن علی بن عبداللہ بن احمد السمہودی ۹۱۱ھ میں مدینہ میں وفات پائی۔
سیرت نبوی کو منظوم شکل میں پیش کرنے والوں میں عبدالعزیز بن احمد المعروف بسعدالدین (م ۶۰۵ھ تقریباً) ابونصر فتح بن موسیٰ القصری (م ۶۶۳ھ) اور ابن الشہید (م ۶۹۳ھ) معروف ہیں۔

کتبِ میلاد کی تالیف

سیرت میں ایک دوسرے انداز پر بھی کتابیں تالیف کی گئی ہیں اور وہ ہے تلخیص کا انداز۔ یہ تلخیص حیاتِ نبوی کے ایک [illegible] پہلو سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں آپ کی ولادت اور اس سے متعلق واقعات، ولادت سے قبل غیبی اشارے، آپ کا بچپن، اس میں ظاہر ہونے والے خارقِ عادت واقعات، آپ کی ماقبل نبوت زندگی، آپ کے پاکیزہ اخلاق، اچھے اوصاف اور ان کاموں سے دوری، جن کے، اس عمر کے نوجوان رسیا ہوتے ہیں، وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔
اس اندازِ تالیف کو "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی کا مختصر بیان اور مابعد رسالت زندگی پر اچٹتی نظر" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ بعض لوگ اسے "میلادِ نبوی" کا نام دیتے ہیں۔ مذہبی لوگوں نے اس قسم کی چیزیں تیار کر رکھی ہیں تاکہ انھیں ہر سال ماہِ ربیع الاول میں مساجد اور دینی جلسوں میں پیش کریں۔ اس موضوع پر بے شمار رسائل اور کتابیں تالیف کی گئی ہیں۔

سیرت نگاری تنقیدی نقطۂ نظر سے

متقدمین کے علمی سرمایہ، خاص طور پر سیرت نگاری سے تعلق رکھنے والے سرمایہ کو، شاید تقدیس کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام قدیم مؤلفین سیرت کی طرح بعد کے مصنفین بھی اس علم کے سلسلے میں مطلوبہ رویہ نہیں اپنا سکے ہیں۔

= عہد حکومت ۶۵۶ھ تک کے حالات بیان کیے ہیں۔ دارالکتب المصریہ میں اس کے ایک سے زائد مخطوطے پائے جاتے ہیں۔

انھوں نے کتبِ سیرت میں مذکور بعض بعید از حقیقت واقعات پر تنقیدی نظر ڈالی ہے نہ ان کے کمزور پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔

قدیم کتبِ سیرت کی جن لوگوں نے تلخیص کی ہے اور ان کے مختصرات تیار کیے ہیں، انھوں نے بعض واقعات کو حذف کر دیا ہے۔ شاید اس سے ان کا مقصد کتاب کا حجم کم کرنا نہیں تھا، بلکہ وہ ان واقعات کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

سیرت نگاری کا فن اپنے گزشتہ تمام ادوار میں تنقیدی نقطۂ نظر سے محروم رہا ہے۔ البتہ ماضی قریب میں یہ خیال راسخ ہوا ہے کہ سیرت میں متعدد ایسے واقعات پائے جاتے ہیں جو سراسر من گھڑت ہیں۔ اس خیال کا پوری جرأت سے اظہار کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں اقدامات کیے گئے ہیں۔ اہلِ قلم نے ایک نیا انداز اختیار کیا ہے۔ وہ سیرت سے ایک یا دو ایسے واقعات منتخب کرتے ہیں جن کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی یا آپ کے قابلِ احترام متعلقین پر زبانِ طعن دراز کی جاتی ہے۔ ان واقعات میں جو من گھڑت باتیں شامل کی گئی ہیں انھیں وہ الگ کرتے ہیں اور دلائل و براہین کے ساتھ انھیں اس طرح نکھار کر پیش کرتے ہیں کہ وہ خود ان طعن کرنے والوں کے خلاف حجت ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر استاذ امام شیخ محمد عبدہٗ نے حضرت زینب بنتِ جحشؓ کے حضرت زید بن حارثہؓ کے ساتھ نکاح، پھر ان کے طلاق دینے کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے واقعہ کی تنقیح کی ہے اور ان موضوع اور بے بنیاد روایات کی تغلیط کی ہے جو اس واقعہ کے ضمن میں نقل کی گئی ہیں اور جن کی بنیاد پر دشمنوں نے ذاتِ نبوی پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ہے۔

بعض لوگوں نے ابنِ اسحاق کا اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ انھوں نے زمانی ترتیب سے سیرت کے واقعات بیان کیے ہیں۔ کتاب کا آغاز آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور اس سے قبل کے واقعات سے کیا ہے۔ پھر سال بہ سال آپ کی حیاتِ طیبہ کے حالات و واقعات ذکر کیے ہیں۔ البتہ انھوں نے صرف وہی واقعات نقل کیے ہیں جو ان کے نزدیک صحیح تھے، اور جو چیزیں ان کے فکر و عقیدہ سے میل نہ کھاتی تھیں انھیں غلط قرار دیا ہے، ان کو بنیاد بنا کر

طعن کرنے والوں کے دعووں کی تردید کی اور جھوٹی باتیں بنانے والوں کا رد کیا ہے۔

سیرت اور تاریخ کو جمع کرنے والے مؤلفین

کچھ دیگر مؤلفین ایسے ہیں جنھوں نے اپنی کتابوں میں سیرتِ رسول کے ساتھ مابعد زمانوں میں پیش آنے والے واقعات وحادثات بھی بیان کیے ہیں۔ گویا ان میں سیرت نگاری بذاتہ مقصود نہیں رہی ہے بلکہ وہ عام تاریخ کے سلسلہ کی ایک کڑی کی حیثیت سے شامل ہے۔ بعض مؤلفین نے اس کا آغاز ابتدائے آفرینش سے کیا ہے، مثلاً ابن جریر طبری، جبکہ بعض نے حیاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نقطۂ آغاز بنایا ہے مثلاً امام حافظ ابو شجاع شیرویہ مؤلف "ریاض الانس" متوفی ۵۰۹ھ۔

سیرتِ ابن اسحاق کی تالیف کا سبب

ابن اسحاق دوسری صدی ہجری کے عمائدین میں سے تھے۔ زمانۂ گذشتہ کے حالات وواقعات کے بارے میں وہ وسیع علم اور تفصیلی معلومات رکھتے تھے۔ قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک مرتبہ وہ بغداد (یا حیرہ) میں عباسی خلیفہ منصور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت اس کا بیٹا مہدی بھی وہاں موجود تھا۔ منصور نے کہا، "ابن اسحاق، جانتے ہو یہ کون ہے؟" انھوں نے جواب دیا: "ہاں یہ امیر المومنین کے صاحب زادے ہیں"۔ منصور نے کہا: "جاؤ اس کے لیے ایک کتاب لکھو جس میں حضرت آدم علیہ السّلام سے لے کر آج تک کے حالات درج ہوں"۔ ابن اسحاق نے خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں کتاب لکھ کر پیش کی تو اس نے کہا: ابن اسحاق آپ نے تو بہت پھیلا دیا، اس کو مختصر کر کے لائیے"۔ ابن اسحاق نے اس کی تلخیص تیار کر کے حاضرِ خدمت کی اور مفصّل کتاب کو شاہی کتب خانہ میں رکھ دیا گیا۔[1]

بعض محققین کا خیال ہے کہ ابن اسحاق نے یہ کتاب خلیفہ کے حکم سے

---

[1] ایک خیال یہ ہے کہ سیرت ابن اسحاق کے اصل نسخہ سے منقول ایک نسخہ مکتبہ کوپریلی آستانہ استنبول میں محفوظ ہے۔

لکھی ہے[1] اور نہ اس کی تصنیف بغداد یا حیرہ میں عمل میں آئی ہے۔ بلکہ اسے اس نے عباسی حکمرانوں کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے مدینہ میں تالیف کیا ہے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ وہ تمام لوگ جن سے ابن اسحاق نے روایت کی ہے، مدنی یا مصری ہیں۔ ان میں سے کسی ایک شخص کا بھی تعلق عراق سے نہیں ہے۔ ابراہیم بن سعد جنھوں نے اس کتاب کی روایت ابن اسحاق سے کی ہے، وہ بھی مدنی ہیں یہی نہیں بلکہ کتاب میں بعض ایسے واقعات مذکور ہیں جن کی روایت عباسی حکمراں کبھی پسند نہ کرتے، مثلاً غزوۂ بدر میں حضرت عباسؓ کی کفار کے ساتھ شرکت اور مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی گرفتاری۔ اس واقعہ کو ابن ہشام نے بعد میں عباسیوں کے خوف سے حذف کر دیا تھا۔

سیرتِ ابن ہشام اور طبری اور دیگر مورخین کی کتابوں میں موجود اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیرتِ ابن اسحاق تین اجزاء پر مشتمل تھی: مبتدا[2]، مبعث[3] اور مغازی[4]۔ مبتدا میں عہدِ جاہلیت کی تاریخ بیان کی گئی تھی۔ اس میں چار فصلیں تھیں۔ پہلی فصل میں گزشتہ انبیاء و رسل کا تذکرہ، دوسری میں عہدِ جاہلیت میں یمن کی تاریخ، تیسری میں عربی قبائل اور ان کی مذہبی رسوم کی تاریخ اور چوتھی میں مکہ کی تاریخ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء و اجداد کا تذکرہ تھا۔ اس جزء میں ابن اسحاق نے واقعات کی اسناد شاذ و نادر ہی بیان کی ہیں اور اساطیر و خرافات اور اسرائیلیات نقل کی ہیں۔

دوسرے جزء (مبعث) میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی اور ہجرت کا بیان ہے۔ اس میں مولف انفرادی واقعات بیان کرنے سے پہلے ان کا ایک جامع خلاصہ بیان کرتا ہے۔ مکمل فہرستیں پیش کرتا ہے، مثلاً حضرت ابوبکرؓ کی دعوت پر اسلام قبول کرنے والوں کی فہرست، حبشہ ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی فہرست، اہلِ مکہ کے اسلام قبول کر لینے کی خبر پاکر حبشہ سے لوٹ آنے والے مسلمانوں کی فہرست وغیرہ، اسی طرح وہ واقعات بیان کرنے میں زمانی ترتیب کا خیال رکھتا

---

[1] دیکھئے جوزف ہورووتس کی کتاب "سیرت نبوی کی اولین کتابیں اور ان کے مؤلفین"۔ عربی ترجمہ ڈاکٹر حسین نصار ص ۶۲ و مابعد (اردو ترجمہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نقوش رسول نمبر جلد اول ص ۷۶۰-۷۶۱۔ مترجم)

ہے اور واقعات کی سندیں بیان کرنے کا بھی اہتمام کرتا ہے۔

سیرتِ ابن اسحاق کا تیسرا جزء (مغازی) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی مؤلف پہلے مشتملات کا ایک جامع خلاصہ بیان کرتا ہے، پھر کسی واقعہ کے سلسلے میں وہ تمام اقوال نقل کرتا ہے جو اس نے راویوں سے اخذ کیے ہیں۔ آخر میں وہ معلومات پیش کرتا ہے جو اس نے خود مختلف مصادر سے حاصل کی ہیں۔ اس جزء میں بھی مختلف غزوات کے سلسلے میں فہرستوں کی کثرت ہے۔ مؤلف نے اسانید اور زمانی ترتیب کا التزام کیا ہے۔

سیرتِ ابن اسحاق میں ابن ہشام کا کام

پھر اللہ تعالیٰ نے ابن اسحاق کی اس علمی کاوش پر مزید کام کرنے کی توفیق ایک ایسے شخص کو دی جو اس کا اہل تھا یعنی ابن ہشام المعافری۔ انھوں نے اس کے جمع و تدوین کی خدمت انجام دی، اس کا خلاصہ کیا اور اُن پر نقد اور استدراک کیا۔ کوئی روایت ابن اسحاق سے رہ گئی تھی تو اسے درج کیا۔ کچھ واقعات کا ذکر نہیں تھا تو ان کا اضافہ کیا۔ سیرت ابن ہشام کی ابتداء میں درج اس عبارت سے ابن ہشام کے اندازِ تالیف کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے:

> "میں انشاء اللہ اس کتاب کا آغاز حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام کے تذکرہ سے کروں گا۔ اس کے بعد ایک ترتیب سے، ان کی نسل میں سے ان لوگوں کا ذکر کروں گا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسبی تعلق تھا، اور ان کے حالات بیان کروں گا۔ حضرت اسماعیلؑ کی نسل میں سے ان لوگوں کا تذکرہ چھوڑ دوں گا جن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبی تعلق نہ ہوگا۔ ایسا میں اختصار کے پیشِ نظر کروں گا۔ ابن اسحاق نے اپنی کتاب میں بعض ایسی چیزیں بھی بیان کی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہیں نہ ان کے بارے میں قرآن میں کچھ نازل ہوا ہے اور نہ وہ سیرت سے متعلق کسی واقعہ کا سبب، تشریح

یا دلیل ہیں۔ انھیں میں نے اختصار کے پیشِ نظر حذف کر دیا ہے۔ انھوں نے کچھ ایسے اشعار نقل کیے ہیں جن سے شاعری میں درک رکھنے والا کوئی شخص واقف نہیں ہے۔ کچھ ایسی باتیں ذکر کی ہیں جو ناشائستہ ہیں یا ان کا تذکرہ بعض لوگوں کو ناگوار ہوگا یا بکّائی نے ان کی روایت کا اعتراف نہیں کیا ہے۔ میں نے ایسی تمام چیزیں حذف کر دی ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر باتوں کا انشاء اللہ استقصاء کروں گا۔"

اقتباس بالا سے واضح ہے کہ ابنِ ہشام نے ابنِ اسحاق کی سیرت سے حضرت آدمؑ سے حضرت ابراہیمؑ تک انبیاء کی تاریخ اور حضرت اسماعیلؑ کی نسل میں سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرۂ نسب میں نہ آنے والوں کا تذکرہ حذف کر دیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے وہ واقعات خارج کر دیے ہیں جو ان کے نزدیک ناقابلِ بیان تھے اور وہ اشعار بھی نکال دیے ہیں جو ان کے نزدیک پایۂ ثبوت کو نہ پہنچتے تھے۔ دوسری طرف انھوں نے بہت سی معلومات اور افکار کا اضافہ کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب سیرت ان کے نام سے معروف اور ان سے منسوب ہوگئی، یہاں تک کہ لوگ اس کے پہلے مؤلف ابن اسحاق کو بھول گئے۔

سُہیلی اور دیگر شارحینِ سیرت ابن ہشام

پھر ابو القاسم عبدالرحمٰن السہیلی (م ۵۸۱ھ) نے اس کتاب میں دلچسپی لی۔ انھوں نے اس پر ایک نئے انداز اور دوسرے نہج سے کام کیا۔ اس کی حیثیت اس کی شرح اور تعلیق کی ہے۔ انھوں نے ابن اسحاق اور ابن ہشام کی کاوشوں کی روشنی میں اپنی کتاب "الروض الأُنف" تالیف کی۔ انھوں نے ان دونوں کے بیانات کی تحقیق کی۔ پھر ان کی شرح کی اور ان پر اضافہ کیا۔ اس طرح ان کا کام سیرت پر ایک نئی کتاب کی حیثیت سے سامنے آیا جو اپنے حجم اور اقوال و روایات کی کثرت کے اعتبار سے گزشتہ دونوں کتابوں سے مختلف تھی اور اس سے زیرِ بحث موضوع میں مؤلف کی مہارت اور وسعتِ معلومات کا اظہار ہوتا تھا۔

سہیلی کے مثل غالباً بدرالدین محمد بن احمد العینی الحنفی (م ۸۵۵ھ) کا بھی کام تھا۔ انھوں نے اس موضوع پر اپنی کتاب "کشف اللثام فی شرح سیرۃ ابن ہشام" تالیف کی جس سے وہ ۸۰۵ھ میں فارغ ہوئے۔ اس کتاب کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ یا اس سے تفصیلی واقفیت دشوار ہے۔

اس سلسلے میں ابوذر الخشنی کی کاوش کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے سیرت ابن اسحاق پر قابلِ قدر کام کیا ہے۔ اس کے غریب الفاظ کی شرح کی ہے اور اس کی غلطیوں کی نشاندہی سے بھی غافل نہیں رہے ہیں۔ خشنی اور سہیلی کے کاموں کو ابن اسحاق اور ابن ہشام کے عظیم الشان کام کا تکملہ کہا جاسکتا ہے۔

سیرتِ ابن اسحاق کی تلخیص کرنے والے

مابعد ادوار میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو ان حضرات کے علمی مرتبہ کا ہو اور اس نے اس کتاب کی نئے انداز سے شرح یا تعلیق کی ہو۔ لوگوں کا میلان اس کتاب کا اختصاریہ تیار کرنے کی طرف ہوگیا۔ مثلاً برہان الدین ابراہیم بن محمد المرحّل الشافعی (م ۷۳۸ھ) نے اس کا خلاصہ تیار کیا اور اس میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کیا۔ اپنی اس تیار کردہ کتاب کو انھوں نے اٹھارہ مجلسوں (ابواب) میں تقسیم کیا اور اس کا نام "الذخیرۃ فی مختصر السیرۃ" رکھا۔ اس کی تالیف سے وہ ۷۱۱ھ میں فارغ ہوئے۔ ان کے بعد عماد الدین ابوالعباس احمد بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن الواسطی (م ۷۱۱ھ) نے اس کا خلاصہ تیار کیا اور اس کا نام "مختصر سیرۃ ابن ہشام" رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تالیف سے وہ ۷۱۱ھ میں فارغ ہوئے۔

سیرتِ ابن اسحاق کو منظوم کرنے والے

ان لوگوں کے بعد شعراء کا گروہ آتا ہے۔ ان کی کوششیں بس یہ رہیں کہ اس کتاب کو ایک نئے قالب یعنی اشعار میں ڈھال دیں۔ اس گروہ میں درج ذیل لوگ آتے ہیں:

ابو محمد عبدالعزیز بن محمد بن سعید الدمیری الدیرینی (م ۶۰۷ھ تقریباً)
ابو نصر فتح بن موسیٰ بن محمد نجم الدین المغربی الحضراوی (م ۶۶۳ھ)
ابو بکر محمد بن ابراہیم بن محمد النابلسی المعروف بابن الشہید (م ۷۹۳ھ) مؤلف "الفتح القریب"
ابو اسحاق الانصاری التلمسانی۔

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ ابن اسحاق کی کتاب کو کس قدر مقبولیت حاصل رہی ہے اور اس پر کس کس پہلو سے کام ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن اسحاق اپنے بعد فنِ سیرت سے اشتغال رکھنے والے تمام مؤلفین کا مرجع رہے ہیں۔ بجا طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ابن اسحاق کے بعد سیرت میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں سب کے مؤلفین نے ان کی کتاب سے خوشہ چینی کی ہے۔ اس کلیہ سے صرف ایک دو مصنفین مثلاً واقدی اور ابن سعد کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔

سطورِ ذیل میں چار مؤلفینِ سیرت کے حالاتِ زندگی پر مختصر روشنی ڈالی جاتی ہے اور وہ ہیں: - ابن اسحاق، ابن ہشام، سہیلی اور ابوذر۔

ابن اسحاق

ابن اسحاق کا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن اسحاق بن یسار بن خیار (یا ابن کوثان) المدنی القرشی۔ ان کی کنیت ابو بکر اور ابو عبداللہ تھی۔ وہ قیس بن مخرمہ بن المطلب بن عبد مناف کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کے دادا یسار عین التمر کے قیدیوں میں سے تھے۔ یہ ایک قدیم شہر ہے جو انبار کے قریب کوفہ کے مغرب میں، صحرا کے کنارے آباد تھا۔ مسلمانوں نے اسے حضرت ابو بکرؓ کے عہدِ خلافت میں ۱۲ھ میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی سپہ سالاری میں فتح کیا تھا۔ حضرت خالدؓ نے عین التمر کے کنیسہ میں ابن اسحاق کے دادا کو ان لڑکوں کے درمیان پایا تھا جو کسریٰ کے اسیر تھے۔ اس کے ساتھ عبداللہ بن ابی اسحاق الحضرمی النحوی کا دادا اور کلبی عالم کا دادا تھا۔ وہاں سے یسار مدینہ لایا گیا۔

ابن اسحاق کی ولادت مدینہ میں ہوئی۔ کتب تاریخ اس کے سن ولادت ۸۵ھ

کو ترجیح دیتی ہیں۔ اس کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے البتہ تمام اقوال ۱۵۰ھ اور ۱۵۳ھ کی درمیانی مدت کے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ابن اسحاق نے اپنی جوانی کے ایام مدینہ میں گزارے۔ سوانح نگاروں نے ان کے بارے میں بیان کیا ہے کہ وہ ایک خوب رو، نوجوان تھے۔ ان کا چہرہ پرکشش، جسمانی بناوٹ ایرانی اور بال خوبصورت تھے۔ ان کے عہد شباب اور اس کی ترنگ کے بارے میں ابن ندیم نے نقل کیا ہے (اگر یہ روایت صحیح ہو) کہ مدینہ کے گورنر تک یہ بات پہنچی کہ محمد بن اسحاق عورتوں سے عشقیہ باتیں کرتے ہیں۔ اس نے انھیں بلوا کر کوڑے لگوائے اور مسجد کے پچھلے حصے میں بیٹھنے سے منع کر دیا۔

ابن اسحاق مدینہ کی رہائش ترک کر کے مختلف شہروں میں گھومتے رہے۔ غالباً ان کا اسکندریہ کا سفر (جو ۱۱۵ھ میں ہوا تھا) پہلا سفر تھا۔ وہاں انھوں نے متعدد مصری اصحاب علم سے روایات لیں، مثلاً عبیداللہ بن المغیرہؒ، یزید بن حبیبؒ۔ ثمامہ ابن شفیؒ، عبیداللہ بن ابی جعفرؒ، قاسم بن قزمانؒ، سکن بن ابی کریمہؒ۔ ابن اسحاق ان حضرات سے بعض احادیث کی روایت میں منفرد ہیں۔ ان کے علاوہ اور کسی نے انھیں روایت نہیں کیا ہے۔

پھر وہ کوفہ، جزیرہ، رے، حیرہ اور بغداد گئے اور غالباً اخیر میں انھوں نے بغداد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ وہاں انھوں نے منصور کے دربار میں حاضری دی اور اس کے بیٹے مہدی کے لیے سیرت کی کتاب تالیف کی (جیسا کہ گزشتہ سطور میں ذکر کیا گیا ہے۔) ان شہروں میں ابن اسحاق کے شاگردوں کی تعداد ان کے مدینہ کے شاگردوں سے زیادہ ہے۔ بلکہ معروف یہ ہے کہ اہل مدینہ میں سے صرف ابراہیم بن سعد نے ان سے روایت لی ہے۔ بغداد میں قیام ہی کے دوران ابن اسحاق کا انتقال ہوا اور مقبرہ خیزران میں تدفین ہوئی۔

ابن اسحاق کے بارے میں ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جانب اگر بعض لوگوں نے ان کی تنقیص میں مبالغہ سے کام لیا ہے تو دوسری جانب بعض دوسرے لوگوں نے خوب بڑھا چڑھا کر ان کی مدح سرائی

کی ہے۔ مثلاً امام مالک بن انسؒ اور ہشام بن عروہ بن الزبیرؒ نے انھیں اہلِ صدق وصفا اور ثقہ محدثین کی صف سے خارج کردیا ہے اور انھیں کذب اور دجل وفریب سے متہم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اس کے علاوہ ان پر تدلیس کرنے، قدریہ جیسا عقیدہ رکھنے، شیعیت کی جانب میلان رکھنے، غیر ثقہ راویوں سے نقل کرنے، اشعار گھڑ کر اپنی کتاب میں شامل کرنے اور انساب میں غلطی کرنے جیسے الزامات بھی لگائے گئے ہیں۔ دوسری جانب متعدد ائمہ عظام مثلاً ابن شہاب زہریؒ، شعبہ بن الحجاجؒ، سفیان ثوریؒ، زیاد بکائیؒ وغیرہ ان کی توثیق کرتے ہیں اور ان پر مذکورہ الزامات میں سے کوئی الزام نہیں لگاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان پر اعتراض اور تنقیص کرنے والوں کے اقوال بے غرض اور مبنی برصواب نہیں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ابن اسحاقؒ امام مالک بن انسؒ کے نسب میں طعن کرتے تھے اور ان کے علم پر بھی تنقید کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے: "میرے پاس مالک کی کتابیں لاؤ، میں اس کی خامیوں کی نشاندہی کردوں۔ ان کو پرکھنے والا تو میں ہوں" اس بنا پر امام مالکؒ ان کے درپے ہوگئے اور ان کے عیوب ڈھونڈنے لگے۔ ان دونوں کے درمیان اس طرح کی کلامی جنگ برپا رہتی تھی۔

ہشام بن عبدالملک ابن اسحاق سے اس بنا پر ناراض تھے کہ وہ اس کی بیوی سے روایت کرنے کا دعویٰ کرتے تھے اور ہشام کے خیال میں روایت کے لیے رؤیت ضروری ہے، جبکہ وہ اپنی بیوی کو اتنے پردے میں رکھتا تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ ہشام کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ روایت پردہ کی اوٹ سے ہوسکتی ہے۔ یا ممکن ہے ابن اسحاق نے اپنی نوعمری میں اس سے روایت لی ہو، پھر اس میں کیا مضائقہ ہے جب کہ اس کی بیوی ابن اسحاق سے ۳۷ سال بڑی تھی۔ اس بنا پر ابن اسحاق نے جب اس سے روایت لی ہوگی اس وقت اس کی (یعنی ہشام کی بیوی کی) عمر پچاس سال سے کم نہ ہوگی۔ مزید برآں اس زمانے میں کسی مرد کا کسی عورت سے روایت کرنا کوئی عجیب وغریب بات بھی نہ تھی۔

ابن اسحاق پر جو دوسرے الزامات لگائے گئے ہیں۔ ان کے سلسلے میں خطیب بغدادی نے "تاریخ بغداد" اور ابن سیدالناس نے "عیون الاثر" میں دو فصلیں منعقد

کی ہیں اور ان تمام الزامات کا جواب دیا ہے۔

ان پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ان کے لیے اشعار گھڑے جاتے تھے اور ان سے انھیں اپنی کتاب میں شامل کرنے کو کہا جاتا تھا اور وہ انھیں شامل کر لیتے تھے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ اعتراض بجا ہے۔ ابن اسحاق کو اشعار سے واقفیت کم تھی۔ وہ صحیح غلط ہر طرح کے اشعار قبول کر لیتے تھے۔ اگر انھوں نے اپنے ذوق کو حکم بنایا ہوتا اور اشعار پر تنقیدی نظر ڈالی ہوتی تو اپنی کتاب میں بہت سے ایسے اشعار شامل نہ کرتے جن کے بارے میں گمان غالب یہ ہے کہ وہ موضوع ہیں اور اس طرح وہ اس شدید تنقید سے محفوظ رہتے جس کا مؤلفینِ سیرت ہر زمانہ میں انھیں نشانہ بناتے آئے ہیں۔

ان کے بارے میں ابن عدی کی یہ بات بالکل صحیح ہے:

> "ابن اسحاق کی فضیلت کے لیے ان کا صرف یہ کام کافی ہے کہ انھوں نے بادشاہوں کی توجہ بے مصرف کتابوں سے ہٹا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی، مبعث اور ابتدائے آفرینش سے بعثت تک کے واقعات کی طرف موڑ دی۔ میں نے ان کی روایت کردہ بہت سی احادیث دیکھی ہیں۔ میں نے ان میں کوئی حدیث ایسی نہیں پائی جسے ضعیف قرار دیا جا سکے۔ بسا اوقات ان سے غلطیاں ہوئی ہیں اور کسی چیز میں وہ متہم ہوئے ہیں، لیکن ایسی غلطیاں دوسرے لوگوں سے بھی ہوئی ہیں۔

ابن اسحاق سے ثقہ راویوں اور ائمہ حدیث نے روایتیں لی ہیں۔ امام مسلمؒ نے متابعات میں ان سے حدیث روایت کی ہے۔ امام بخاریؒ نے متعدد مقامات پر ان سے استشہاد کیا ہے۔ ان کی روایات سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں بھی موجود ہیں۔

ابن ہشام

ابن ہشامؒ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: ابو محمد عبد الملک بن ہشام بن ایوب الحمیری بعض سوانح نگاران کا نسب معافر بن یعفر تک پہنچاتے ہیں۔ ان کا قبیلہ بہت بڑا تھا

اور اس کے بہت سے افراد مصر آ گئے تھے۔ بعض لوگ ان کا نسب ذہل اور بعض سدوس تک لے جاتے ہیں۔ اس بارے میں کوئی قطعی رائے موجود نہیں ہے۔ یہی حال ہر اس شخص کا ہوتا ہے جس نے مختلف شہروں میں سکونت اختیار کی ہو اور اس شہر میں جہاں اس کا گھرانہ اور خاندان رہتا ہو، اسے مستقل رہائش کا موقع نہ ملا ہو۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ ان کا گھرانہ حسب و نسب کے اعتبار سے اس مرتبہ کا نہ تھا کہ لوگ ان کا شجرۂ نسب یاد رکھتے اور روایت کرتے۔

ابن ہشام نے بصرہ میں پرورش پائی، پھر مصر میں سکونت اختیار کی۔ سوانح نگار یہی بیان کرتے ہیں۔ ان دو شہروں کے علاوہ ان کے اور کہیں جانے کا تذکرہ نہیں ملتا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان کی زندگی صرف انہی دو شہروں میں محصور نہیں تھی۔ خاص طور پر ایسے زمانے میں جب علم سماعی طریقہ پر حاصل کیا جاتا تھا اور اس کی تحصیل کے لیے علما دور دراز کے سفر کیا کرتے تھے۔

ابن ہشام کے سنہ وفات کے بارے میں کوئی قطعی رائے نہیں ملتی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی وفات ۲۱۸ھ میں ہوئی جب کہ بعض دوسرے لوگ سنہ وفات ۲۱۳ھ قرار دیتے ہیں۔ جب تاریخ وفات کا یہ حال ہو تو تاریخ پیدائش کا قطعی علم کیونکر ہو سکتا ہے، جب کہ مصر ان کا وطن نہیں تھا اور غالب گمان یہ ہے کہ جہاں سے وہ مصر آئے تھے وہ بھی ان کا وطن نہیں تھا۔

ابن ہشام نحو اور عربی زبان کے امام تھے۔ ذہبیؒ اور ابن کثیرؒ نے بیان کیا ہے کہ جب وہ مصر آئے تو امام شافعیؒ نے ان سے ملاقات کی اور دونوں نے ایک دوسرے کو اہل عرب کے بہت سے اشعار سنائے۔ اس کے باوجود یہ بات عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے کہ وہ جب کتاب سیرت میں ابن اسحاق سے ایسے اشعار نقل کرتے ہیں جو بظاہر موضوع اور ناموزوں معلوم ہوتے ہیں تو ان کے بارے میں اپنی کوئی قطعی رائے ظاہر نہیں کرتے اور اپنے شعری ذوق سے کوئی فیصلہ نہیں کرتے، بلکہ انھیں نقل کر کے اس طرح کا جملہ لکھ دینے پر اکتفا کرتے ہیں: "اشعار سے واقف لوگوں نے اسی طرح بیان کیا ہے"۔

ان کی ایک سے زائد فنون میں متعدد تصانیف ہیں۔ مثلاً سیرت ابن اسحاق [۵۰]

پران کے کام کے علاوہ "شرح ماوقع فی اشعار السیر من الغریب" اور کتاب التیجان لمعرفۃ ملوک الزمان۔ مؤخر الذکر کتاب ابھی حال ہی میں طبع ہوئی ہے[1]۔ سیرت ابن اسحاق پران کے کام کو غیر معمولی شہرت ملی اور وہ کتاب انہی کے نام سے معروف ہوئی۔ اس میں ان کا کام ابن اسحاق سے کم اہم نہیں ہے۔

سہیلی

سہیلی کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن احمد بن اصبغ بن الحسین ابن سعدون بن رضوان بن فتوح۔ ان کی کنیتیں ابوالقاسم، ابوزید اور (ایک قول کے مطابق) ابوالحسن بیان کی گئی ہیں۔ ان کے باپ اور دادا دونوں خطیب کے لقب سے مشہور تھے۔ باپ کی کنیت ابومحمد، دادا کی ابوعمرو اور پردادا کی ابوالحسن تھی۔ ان کی نسبتیں خثعمی، سہیلی، اندلسی اور مالقی معروف ہیں۔

"سُہیل" جس کی طرف ان کی نسبت ہے، اندلس میں مالقہ کے علاقے میں ایک وادی کا نام ہے[2] اس میں کئی گاؤں آباد ہیں۔ ان میں سے ایک گاؤں میں سہیلی پیدا ہوئے۔ وہ اندلس میں طویل عرصے تک رہے۔ وہاں علم کے سرچشموں سے سیراب ہوئے اور مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کی۔ وہاں انھیں بلند مقام ملا۔ ان سے کسب فیض کے لیے لوگ دور دور سے آنے لگے۔ ان کی شہرت مراکش تک جا پہنچی تو وہاں کے حکمراں نے آپ کو طلب کیا۔ آپ وہاں تشریف لے گئے تو اس نے آپ کے ساتھ حسن سلوک کیا، آپ کی خوب خاطر مدارات کی اور آپ کو منصب قضا پر فائز کیا۔ آپ کی وجہ سے اس کا کردار قابل تعریف ہوگیا تھا۔ آپ کا قیام وہاں تین سال رہا اور وہیں وفات پائی۔

مراجع سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالقاسم سہیلی کی ولادت ۵۰۸ھ اور وفات ۵۸۱ھ

---

[1] یہ تصنیف "کتاب التیجان فی ملوک حمیر" کے نام سے ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے چھپ چکی ہے۔ (مترجم)

[2] صفدی نے "نکت الہمیان" میں لکھا ہے کہ "قریب کی پہاڑی سے پوری وادی نظر آتی ہے۔"

میں ہوئی۔ ابن العماد حنبلی نے اپنی کتاب "شذرات الذہب" میں لکھا ہے کہ ان کی وفات شعبان ۵۸۱ھ میں ہوئی۔ وہ بہتر برس کے تھے۔

سہیلی کی سب سے مشہور تالیف "الروض الانف" ہے۔ صفدی نے "نکت الہمیان" میں لکھا ہے: "یہ ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔ اسے مصنف نے بہت اچھے طریقے پر تالیف کیا ہے۔ ابتدا میں انھوں نے ذکر کیا ہے کہ اس کی تالیف میں انھوں نے ایک سو بیس[۱۲۰] سے زائد کتابوں سے مدد لی ہے"۔ ان کی دیگر تالیفات درج ذیل ہیں:

التعریف والإعلام بما فی القرآن من الأسماء والأعلام

نتائج النظر

مسألة رؤیة اللہ عزّ وجلّ ورؤیة النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المنام

مسألة السّر فی عَوَر الدجّال

شرح آیة الوصیة

شرح الجمل۔ نامکمل

ان کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی ان کی تصانیف تھیں جن کی طرف سوانح نگاروں نے اشارہ کیا ہے مگر ان کے ناموں کی صراحت نہیں کی ہے۔

"الروض الانف" کے علاوہ ان کی کوئی کتاب دستیاب نہیں ہے۔ اس کی تالیف انھوں نے مراکش جانے سے قبل مالقہ میں کی تھی۔ اسے انھوں نے محرم ۵۶۹ھ میں املا کرانا شروع کیا تھا اور اس کی تالیف سے اسی سال جمادی الاولی میں فارغ ہوئے۔

سہیلی کی عظمت کے لیے یہی کتاب کافی ہے۔ اس سے مختلف اعتبارات سے ان کی وسیع و عمیق معلومات کا اظہار ہوتا ہے اور مختلف علوم و فنون میں ان کی مہارت ثابت ہوتی ہے۔ اس میں وہ مؤرخ بھی نظر آتے ہیں اور ماہر لغت بھی۔ ادیب بھی نظر آتے ہیں اور نحوی بھی۔ محدّث بھی نظر آتے ہیں اور عالم قراءات بھی۔ مزید برآں سہیلی شاعر بھی تھے۔ ان کے دعائیہ اشعار مشہور ہیں۔

ابن دحیہ فرماتے ہیں کہ "سہیلی نے مجھے اپنے یہ اشعار سنائے اور فرمایا کہ" ان

اشعار کو پڑھ کر میں نے اللہ تعالیٰ سے جو بھی مانگا مجھے مل کر رہا"

یا من یری ما فی الضمیر ویسمع	انت المُعَدُّ لکل ما یُتوقَّعُ
یا من یُرجّیٰ للشدائد کلّها	یا من الیہ المشتکیٰ والمفزع
یا من خزائن رزقہ فی قولکن	اَمنن فانّ الخیر عندک اجمع
مالی سوی قرعی لبابک حیلة	فلئن رُددت فای بابٍ اقرع
مالی سوی فقری الیک وسیلة	وبالافتقار الیک فقری ادفع
من ذا الذی ادعوا ھتف باسمہ	ان کان فضلک عن فقیرک یمنع
حاشا لمجدک ان تُقنِّطَ عاصیًا	الفضل اَجزَل والمواھب اوسع

(ترجمہ) اے وہ ذات جو دل میں بھی جھانک لیتی اور دل کی باتیں بھی سن لیتی ہے۔ تو ہی تمام توقعات اور آرزوؤں کا مرجع ہے۔

اے وہ ذات جس کے تمام شدائد میں تو لگائی جاتی ہے، جس سے فریاد کی جاتی ہے اور جس کی پناہ چاہی جاتی ہے۔

اے وہ ذات جس کے رزق کے خزانے کلمۂ "کن" میں پوشیدہ ہیں۔ کرم کر تمام خیر صرف تیری بارگاہ میں ہے۔

تیرا در کھٹکھٹانے کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر میں تیرے در سے لوٹا دیا جاؤں تو پھر کون سا در کھٹکھٹاؤں گا؟

تیری محتاجی کے علاوہ میں کوئی ذریعہ نہیں پاتا۔ تیرا محتاج بن کر ہی میں اپنا فقر دفع کر سکتا ہوں۔

اگر تو نے اپنے فقیر و محتاج پر اپنا فضل نہ فرمایا تو میں کس کو پکاروں گا اور کس کے نام کی دہائی دوں گا؟

تیری بزرگی کے شایانِ شان نہیں ہے کہ تو کسی گناہ گار کو مایوس کر دے۔ تیرا فضل بے پایاں ہے اور تیری عطا و بخشش وسیع ہے۔

ابن العماد نے بھی درج بالا اشعار نقل کیے ہیں، پھر لکھا ہے کہ ان کے علاوہ بھی ان کے بہت سے اشعار ہیں۔ صفدی نے نکت الہمیان میں اور مقری نے نفح الطیب میں ان کے بعض قطعات درج کیے ہیں۔

سہیلی کی تالیفات پر ایک نظر ڈالنے سے ان کے اخلاقی رجحان کا پتہ چل جاتا ہے۔ انھوں نے دین کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور آخری لمحے تک

درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ اسی لیے ان کی نیکی، ورع اور تقویٰ لوگوں کے درمیان معروف تھا۔ وہ بڑے قناعت پسند بھی تھے۔ کفاف پر گزارا کرتے تھے۔

معروف ہے کہ وہ مالکی مسلک پر عامل ہے۔ ستّرہ سال کی عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ علم القراءات متعدد اہلِ فن سے حاصل کیا اور سیبویہ کی کتاب پر ان سے مناظرہ بھی کیا۔

ابوذر الخُشَنی

ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: مصعب بن محمد بن مسعود بن عبداللہ بن مسعود الجیّانی الخُشَنی۔ وہ ابن ابی الرکب کے نام سے بھی معروف تھے۔

جَیّانی جیّان کی طرف نسبت ہے۔ یہ اندلس کے ایک وسیع علاقہ کا نام ہے جس میں بہت سے گاؤں ہیں۔ یہ البیرہ نامی علاقہ سے متصل، جوف کی جانب، قرطبہ کے مشرق میں واقع ہے۔ اس کے اور قرطبہ کے درمیان ستّرہ فرسخ کا فاصلہ ہے۔ اور خُشَنی خُشَین کی جانب نسبت ہے۔ یہ اندلس کا ایک گاؤں تھا جہاں قبیلہ قُضاعہ کی ایک شاخ رہتی تھی۔ اس کے سربراہ کا نام خُشین بن النمر بن وبرہ بن تغلب تھا۔

معروف یہ ہے کہ ابوذر نے اپنا بچپن جیّان میں گزارا۔ وہیں اپنے والد سے اخذ وسماعت کی۔ پھر جب ان کے والد اپنی زندگی کے آخری ایام میں جیّان سے نقلِ مکانی کر کے غرناطہ چلے گئے تو وہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً دس سال تھی۔ (اس لیے کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو ان کی عمر گیارہ سال تھی) پھر انھوں نے فاس کا سفر کیا اور وہاں ابوعبیداللہ النمیریؒ، ابوالحسن بن حسینؒ اور ابوعبداللہ ابن الرمانہؒ سے سماعت کی۔ اس کے بعد تلمسان تشریف لے گئے اور وہاں ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن یحییٰ بن الحسن القرشیؒ اور ابومروان عبیداللہ بن ہشام الحضرمیؒ سے کسبِ فیض کیا۔ پھر بجایہ کا رخ کیا اور وہاں ابوبکر بن رزقؒ، ابوالعباس الخرّوبیؒ، ابواسحاق بن ملکونؒ اور ابومحمد عبدالحق بن عبدالرحمٰن الاشبیلیؒ سے علم حاصل کیا۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ تینوں شہروں کا سفر انھوں نے اسی ترتیب سے کیا تھا۔ ابن الآبار نے ان کے شیوخ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہی ترتیب رکھی ہے۔ اگرچہ کوئی

وجہ ترجیح موجود نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسری ترتیب ہو تب بھی بہرحال اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابوذر خشنی ان تینوں شہروں میں تشریف لے گئے تھے۔ پھر وہ اشبیلیہ، وہاں کی مسجد کے خطیب کی حیثیت سے تشریف لے گئے اور وہاں ایک عرصہ تک مقیم رہے۔ خطابت کے ساتھ وہ وہاں عربی زبان کی تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے اور طلبہ بڑی تعداد میں ان کے پاس استفادہ کے لیے آتے تھے۔ پھر وہ جیّان تشریف لے گئے تو انھیں منصب قضا پر فائز کیا گیا۔ وہ وہاں لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے اور ان کے نزاعات اور خصومات کا تصفیہ کرتے تھے۔ پھر انھیں دوبارہ فاس کی یاد آئی تو جیّان سے وہاں منتقل ہو گئے۔ وہاں وہ عربی زبان اور حدیث کے استاد تھے۔ وہیں ان کی وفات ہوئی۔

اس تفصیل سے ابوذر خشنی کی یہ شخصیت ابھرتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے اور اس میں رسوخ پانے کے لیے کوشاں رہتے تھے اور علم کے بڑے مرتبے پر فائز تھے۔ انھوں نے متعدد عہدوں پر رہ کر اپنی ذات سے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔ وہ اندلس میں عربی زبان کی ترویج و اشاعت کے علم بردار تھے۔ مختلف ادبیات اور زبانوں سے واقف تھے۔ شاعر اور نقاد تھے۔ عربوں کی تاریخ، واقعات، اشعار اور لغات پر دست رس رکھتے تھے۔ ان کے زمانے میں کوئی شخص ان سے زیادہ مختلف علوم و فنون میں ماہر، انھیں حفظ کرنے اور تحریری طور پر انھیں منتقل اور محفوظ رکھنے والا نہ تھا۔

سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کی بہت سی تصانیف ہیں، لیکن "شرح غریب سیرۃ ابن اسحاق" (جو طبع ہو چکی ہے) کے علاوہ ان کی اور کوئی کتاب دستیاب نہیں ہے۔ عروض پر ان کی ایک کتاب کا تذکرہ ابن الابار نے کیا ہے لیکن اس کا نام ذکر نہیں کیا ہے۔ سیوطی نے "بغیہ" میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جمع الجوامع" میں مذکور ہے کہ ان کی تصانیف میں سے ایک "الاملاء علی سیرۃ ابن ہشام" تھی۔ یہ تمام تصانیف حوادث زمانہ کی نذر ہو گئیں۔

ابوذر مالکی مسلک پر عمل پیرا تھے۔ باوقار، صاحب مروّت اور حیادار تھے۔ ان کی مجلس بڑی پُر ہیبت رہتی تھی۔ سلف کے طریقہ پر عمل کرنے میں معروف تھے۔

۴۵۵

بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو زیادہ سوالات کرنے سے منع کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں ان سے زیادہ بارعب اور پُر ہیبت کوئی اور شخصیت نہ تھی۔

مستشرق پولس برونل (P. BRONNLE) نے لکھا ہے کہ ابوذر خشنی کی ولادت ۵۳۳ھ (یعنی ان کے والد کی وفات سے گیارہ سال قبل) اور وفات ۶۰۴ھ میں ہوئی۔ ابن الابار نے بھی یہی سنہ وفات لکھا ہے۔ انھوں نے مزید لکھا ہے کہ ان کی وفات بروز دوشنبہ، ۱۱/شوال چاشت کے وقت ہوئی اور اسی دن عصر کے وقت عدوۃ القرویین، فاس میں تدفین ہوئی۔ سنہ ولادت کے بارے میں انھوں نے دو اقوال نقل کیے ہیں۔ ایک ۵۳۵ھ اور دوسرا ۵۳۳ھ، اول الذکر کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے۔ ابن العماد نے لکھا ہے کہ ابوذر کی وفات ستّر سال کی عمر میں ہوئی۔ اگر یہ بات صحیح ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی وفات شوال ۶۰۴ھ میں ہوئی تو ان کا سنہ ولادت ۵۳۵ھ ہی صحیح قرار پاتا ہے۔

مراجع

۱۔ بغیۃ الوعاۃ : جلال الدین سیوطی
۲۔ البدایہ والنہایۃ : ابن کثیر
۳۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ : جرجی زیدان
۴۔ تاریخ بغداد : خطیب بغدادی
۵۔ تہذیب التہذیب : ابن حجر عسقلانی
۶۔ حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر والقاہرہ : جلال الدین سیوطی
۷۔ ضحی الاسلام : احمد امین
۸۔ الطبقات الکبریٰ : ابن سعد
۹۔ عیون الاثر فی المغازی والشمائل والسیر : ابن سید الناس
۱۰۔ فہرست : ابن ندیم
۱۱۔ کشف الظنون : ملا کاتب چلپی
۱۲۔ الکمال فی معرفۃ الرجال : ابن النجار
۱۳۔ معجم الادباء : یاقوت حموی
۱۴۔ معجم البلدان : یاقوت حموی
۱۵۔ معجم ما استعجم : بکری
۱۶۔ الوسیط : احمد اسکندری و مصطفی عنانی
۱۷۔ وفیات الاعیان : ابن خلکان

علی ابن مدینی

احوال اور علمی آثار

تحریر : ڈاکٹر محمد مصطفی اعظمی
ترجمہ : مولانا محمد اسلام عمری

نام ونسب

نام علی اور کنیت ابوالحسن تھی۔ ابن المدینی کے نام سے شہرت پائی۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: علی بن عبداللہ بن جعفر بن نجیح السعدی۔ عروہ بن عطیہ سعدی کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھے۔ آپ کی پیدائش بصرہ میں ۱۶۱ھ میں ہوئی [1]

خاندان

آپ کے والد عبداللہ بن جعفر کا شمار محدثین میں ہوتا تھا۔ انھوں نے عبداللہ بن دینار، علاء بن عبدالرحمٰن، ابوحازم، ابوالزناد، سہل بن ابوصالح، موسیٰ بن عقبہ اور ابن عجلان وغیرہ سے روایت کی ہے۔ ان سے روایت کرنے والوں میں علی بن المدینی کے علاوہ اسماعیل بن جعفر بن کثیر، بشر بن معاذ عقدی، علی بن جعد، علی بن حُجر، قتیبہ بن سعید، ابوکامل جحدری اور یحییٰ بن ایوب مُقابری کے اسماء گرامی ملتے ہیں۔

علامہ ابن معین فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن جعفر کا شمار محدثین میں ہوتا ہے لیکن زندگی کے آخری ایام میں ان کا حافظہ کمزور ہوگیا تھا، چنانچہ وہ بالاتفاق 'ضعیف' قرار دیے گئے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۷۸ھ میں ہوا [2] ابن المدینی کی والدہ نہایت عقل مند اور بہت سمجھ دار خاتون تھیں۔ ان کا شمار راسخ العقیدہ مسلمان خواتین میں ہوتا تھا۔ اس کا

ثبوت درج ذیل واقعہ سے ملتا ہے۔ علی ابن مدینی اپنے علمی سفر کی وجہ سے عرصہ تک وطن سے دور رہے اور ان کی والدہ بصرہ میں تنہا رہیں۔ جب وہ طویل مدت کے بعد وطن واپس آئے تب ان کی والدہ کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملی۔

علی بن مدینی بیان کرتے ہیں: "میں یمن چلا گیا، جس کی وجہ سے کچھ عرصہ بصرہ سے غیر حاضر رہا (راوی کا خیال ہے کہ انھوں نے یہ مدت تین سال بتائی تھی) اس وقت میری والدہ باحیات تھیں۔ جب میں واپس آیا تو کہنے لگیں۔ لختِ جگر! فلاں شخص تمہارا دوست اور فلاں تمہارا دشمن ہے۔ میں نے کہا آپ کو اس کا علم کیسے ہوا؟ انھوں نے جواب دیا کہ فلاں فلاں (جن میں یحییٰ بن سعید کا بھی نام لیا) لوگ میرے پاس آتے، مجھے تسلی دیتے اور کہتے "صبر کیجئے آپ کا لختِ جگر دولتِ علم سے مالا مال ہو کر واپس آئے گا اور آپ اسے دیکھ کر خوش ہو جائیں گی"۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لوگ تم سے محبت کرنے والے اور تمہارے دوست ہیں اور فلاں فلاں جب میرے پاس آتے تو کہتے اپنے بیٹے کو خط لکھو، اسے سخت سست کہو اور گھر واپس آنے کے لیے مجبور کر دو۔[۳]

اس واقعہ سے علی ابن مدینی کی والدہ کی عظمت، دانائی اور ہوشمندی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ماں کی ان خوبیوں نے بیٹے کی پرورش، پرداخت اور تربیت پر اچھے اثرات مرتب کیے تھے۔

حصولِ علم

علی ابن مدینی کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں متعین طور سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اتنا معلوم ہے کہ انھوں نے اپنے والد (متوفی ۱۷۸ھ) سے روایت کی ہے اسی طرح انھوں نے حماد بن زید (متوفی ۱۷۹ھ) سے بھی روایت کی ہے۔[۴]

بعض محدثین کہتے ہیں کہ علی ابن مدینی نے اپنے بچپن ہی میں حماد بن زید سے روایت کی تھی۔ بہر حال اتنی بات طے شدہ ہے کہ اس وقت ان کی عمر بیس سال سے کم تھی۔ جعفر بن محمد صائغ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ عفان، علی ابن مدینی، ابوبکر بن ابی شیبہ اور احمد بن حنبل کسی جگہ اکٹھا ہوئے۔ عفان نے کہا، علی حماد سے، احمد ابراہیم بن

سعد سے اور ابو بکر شریک سے روایت کریں تو ضعیف قرار پاتے۔" یہ سن کر علی ابن المدینی نے کہا کہ "عفان بھی شعبہ سے روایت کریں تو ضعیف قرار پاتے ہیں"۔

ذہبی فرماتے ہیں کہ "ان صورتوں میں ان لوگوں کے ضعیف ہونے کا سبب یہ ہے کہ اپنے شیوخ سے روایت کرتے وقت یہ حضرات کم عمر تھے"۔

اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ علی ابن مدینی نے حدیثِ نبوی کی روایت و کتابت کا آغاز پندرہ سال کی عمر سے کر دیا تھا۔ غالب گمان یہ ہے کہ انھوں نے حصولِ علم کی ابتداء اپنے شہر سے کی تھی۔ بعد میں دیگر مقامات کا سفر کیا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علمی اسفار والد کے انتقال کے عرصہ بعد شروع ہوئے۔

خواب

ابو قدامہ کہتے ہیں "میں نے علی ابن مدینی کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا کہ "ایک مرتبہ میں نے خواب دیکھا کہ ثریا ستارہ میرے بہت قریب آگیا ہے۔ یہاں تک کہ میں نے اس کو پکڑ لیا"۔ ابو قدامہ فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خواب کو سچ کر دکھایا اور فنِ حدیث میں وہ اتنے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے جس تک کوئی اور نہیں پہنچ سکا"۔

علمی اسفار

اس زمانہ میں طالب علم کو محدثین کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے عالم اسلام میں پھیلے ہوئے اساتذہ اور شیوخ سے استفادہ کے لیے مختلف مقامات و ممالک کا سفر کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ علی ابن المدینی نے بھی حصولِ علم کے لیے رختِ سفر باندھا۔ خلیلی لکھتے ہیں "امام احمد نے یحییٰ بن معین اور علی ابن المدینی کے ساتھ مکہ کا سفر کیا۔ پھر یہ حضرات صنعا تشریف لے گئے۔ پھر عراق کے شہروں کوفہ، بصرہ اور واسط واپس آگئے، وہاں سے امام احمد تنہا ملک شام چلے گئے"۔

علی ابن مدینی کے طویل سفر کا تذکرہ ابھی ہو چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر انھوں نے بڑی عمر میں کیا تھا۔ اس لیے کہ اس سفر سے پہلے وہ اطرافِ حدیث پر ایک جامع مسند تصنیف کر چکے تھے۔ وہ اپنے اس سفر کے بارے میں بیان کرتے ہیں

کہ میں نے اطراف پر ایک جامع مسند مرتب کی تھی۔ اس کو کاغذات میں لکھ کر ایک بڑے بستہ میں رکھ دیا اور اسے گھر میں چھوڑ کر سفر پر چلا گیا۔ واپسی پر ایک روز اپنے لکھے ہوئے مسودہ کو دیکھنا چاہا، بستہ کو ہلایا تو اندازہ ہوا کہ خلافِ توقع زیادہ بھاری ہے، کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ پورا مسودہ دیمک چاٹ گئی ہے اور کتاب مٹی کا ڈھیر بن گئی ہے۔ مسودہ کی یہ درگت دیکھ کر دوبارہ اسے مرتب کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔[۸]

تصانیف

امام علی ابن مدینی کا شمار عظیم محدثین میں ہوتا ہے، ان کی امامت اور جلالت شان پر اجماع ہے۔ ان کی کتابیں بڑی معرکہ آرا ہیں[۹] ان کی تعداد تقریباً دو سو تک پہنچتی ہے[۱۰] ابن ندیم نے ان کی سات کتابوں کے نام ذکر کیے ہیں (۱) کتاب المسند لعلۃ (۲) کتاب المدلسین (۳) کتاب الضعفاء (۴) کتاب العلل (۵) کتاب الاسماء والکنیٰ (۶) کتاب الاشربۃ (۷) کتاب التنزیل[۱۱]

ابن خیر اشبیلی نے اپنی فہرست میں علی ابن مدینی کی مرویات کے ضمن میں کتاب الطبقات (دو جلدیں) کا تذکرہ کیا ہے۔ ابن مدینی کی تصنیفات کی سب سے طویل فہرست حاکم نیشاپوری نے دی ہے۔ اس میں ۲۹ کتابوں کا تذکرہ ہے[۱۲]

(۱) کتاب الأسامی والکنیٰ (آٹھ جلدیں)
(۲) کتاب الضعفاء (دس جلدیں)
(۳) کتاب المدلسین (پانچ جلدیں)
(۴) کتاب اوّل من نظر فی الرجال وفحص عنہم (ایک جلد)
(۵) کتاب الطبقات (دس جلدیں)
(۶) کتاب من روی عن رجل لم یرہ (ایک جلد)
(۷) علل المسند (تیس جلدیں)
(۸) کتاب العلل لاسماعیل القاضی (چودہ جلدیں)
(۹) علل حدیث ابن عیینہ (تیرہ جلدیں)
(۱۰) کتاب من لایحتج بحدیثہ ولا یسقط (دو جلدیں)

(۱۱) کتاب الکنیٰ (پانچ جلدیں)
(۱۲) کتاب الوہم والخطا (پانچ جلدیں)
(۱۳) کتاب قبائل العرب (دس جلدیں)
(۱۴) کتاب من نزل من الصحابہ سائر البلدان (پانچ جلدیں)
(۱۵) کتاب التاریخ (دس جلدیں)
(۱۶) کتاب العرض علی المحدّث (دو جلدیں)
(۱۷) کتاب من حدث ثم رجع عنہ (دو جلدیں)
(۱۸) کتاب یحییٰ وعبدالرحمٰن فی الرجال (پانچ جلدیں)
(۱۹) سؤالاتہ لیحییٰ (دو جلدیں)
(۲۰) کتاب الثقات والمثبتین (دس جلدیں)
(۲۱) کتاب اختلاف الحدیث (پانچ جلدیں)
(۲۲) کتاب الاسامی الشاذہ (تین جلدیں)
(۲۳) کتاب الاشربہ (تین جلدیں)
(۲۴) کتاب تفسیر غریب الحدیث (پانچ جلدیں)
(۲۵) کتاب الاخوۃ والاخوات (تین جلدیں)
(۲۶) کتاب من یُعرف باسمہ دون اسم ابیہ (دو جلدیں)
(۲۷) کتاب من یُعرف باللقب (ایک جلد)
(۲۸) کتاب العلل المتفرقہ (تیس جلدیں)
(۲۹) کتاب مذاہب المحدثین (دو جلدیں)

قاضی ابوبکر فرماتے ہیں کہ ان کتابوں میں سے چار یا پانچ کو چھوڑ کر سب حوادثِ زمانہ کا شکار ہو گئیں۔ ان کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے بہت سے علوم ختم ہو گئے اور امت بے شمار فوائد سے محروم ہو گئی۔[۱۱۵]

جرح وتعدیل میں عدمِ مداہنت

علی ابن مدینی کے والد فنِ حدیث میں ضعیف تھے۔ اس لیے وہ ان سے

روایت نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ علی بن مدینی اپنے والد کے نافرمان ہیں لیکن اپنے والد کے آخری ایامِ حیات میں وہ ان سے روایت کرنے لگے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ علی بن مدینی کے اپنے والد سے روایت کرنے کے باوجود وہ (یعنی ان کے والد) قوی نہیں شمار کیے گئے تھے۔ عبداللہ اہوازی فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے اصحاب کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ علی بن مدینی نے اپنے والد سے روایت کی، ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ "شیخ کی روایت میں ضعف ہے"۔ امام حاکم نے قتیبہ کا واقعہ نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ "ایک مرتبہ میں بغداد گیا، لوگ جمع ہو گئے، ان میں امام احمد بن حنبل اور علی ابن مدینی بھی تھے میں نے کہا "ہم سے عبداللہ بن جعفر نے روایت کی ہے ...." ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک نوجوان کھڑا ہوا اور کہا: اے ابو رجاء! ان صاحب کا لڑکا تو ان سے ناراض ہے (پھر ان کی روایت کیوں کر قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔)

ابن حبان فرماتے ہیں کہ علی بن مدینی سے ان کے والد کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: کسی دوسرے سے پوچھ لو۔ لوگوں نے اصرار کیا تو گردن جھکائی، پھر سر اٹھا کر فرمایا "وہ دین دار شخص تھے"۔

تاریخ بخاری کی ایک روایت میں صالح بن محمد کہتے ہیں کہ: میں نے علی بن مدینی کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میرے والد راست گو ہیں، وہ میرے نزدیک دراوردی سے زیادہ پسندیدہ ہیں۔[۱۵]

معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت درست نہیں ہے کیوں کہ ابن مدینی سے روایت کرنے والے تمام لوگوں کا بیان ہے کہ وہ اپنے والد کو ضعیف قرار دیتے تھے۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جرح و تعدیل کے معاملے میں وہ کتنے سخت تھے۔

معاصرین کی نظر میں

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علی ابن مدینی کو علل حدیثِ نبوی کی معرفت میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ اس کے ساتھ وہ رجالِ حدیث کی مکمل معلومات رکھنے والے، وسیع حافظہ کے

مالک اور اس فن میں تبحرِ علمی کے حامل تھے۔ اپنے زمانہ میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔[۱۶]

علامہ خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں: "علی ابن مدینی اس فن (علل الحدیث) کے فلسفی اور طبیب تھے نیز جماعتِ محدثین کے ترجمان اور خطیب تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے اور ان کی قبر کو منور کردے۔"[۱۷]

علی ابن مدینی کو ان کی زندگی ہی میں شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ یہ معمولی بات نہیں کہ کسی عالم کو اس کے معاصر علماء عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھیں۔ علی ابن مدینی کے تمام معاصرین ان کے علم کا اعتراف کرتے تھے۔ اس شخص کی عظمت کا کیا کہنا جو چت لیٹا ہوا ہو، امام احمد بن حنبلؒ اس کے دائیں جانب اور یحییٰ بن معینؒ اس کے بائیں جانب بیٹھے ہوں اور وہ ان دونوں کو املا کرا رہا ہو۔[۱۸]

فن حدیث میں امام بخاریؒ کے مرتبہ ومقام سے سب واقف ہیں۔ فرماتے ہیں "میں نے علی ابن مدینی کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے اپنے آپ کو چھوٹا محسوس نہیں کیا۔"[۱۹]

امام احمد بن حنبلؒ احترام میں علی ابن مدینی کا نام نہیں لیتے تھے بلکہ ان کی کنیت ابوالحسن سے ان کا تذکرہ کرتے تھے۔[۲۰]

ابن مہدی فرماتے ہیں: "علی ابن مدینی حدیثِ نبوی کے سب سے بڑے عالم تھے۔"[۲۱] یحییٰ بن قطانؒ کا کہنا ہے کہ "لوگ مجھے علی ابن مدینی سے محبت کرنے پر ملامت کرتے ہیں حالانکہ میں ان سے فیض حاصل کرتا ہوں۔"[۲۲] ابوعبید قاسم بن سلامؒ فرماتے ہیں: علم کا منتہیٰ چار اشخاص ہیں۔ ابوبکر بن ابوشیبہؒ سب سے زیادہ بیان کرنے والے، امام احمد بن حنبلؒ سب سے بڑے فقیہہ، علی ابن مدینیؒ سب سے بڑے عالم اور یحییٰ بن معینؒ سب سے زیادہ لکھنے والے ہیں۔[۲۳]

امام ابوداؤدؒ سے پوچھا گیا کہ علی ابن مدینی بڑے عالم ہیں یا احمد بن حنبل؟ انھوں نے جواب دیا کہ "امام احمد بن حنبل کی بہ نسبت علی بن مدینی اختلافِ حدیث کا زیادہ علم رکھتے ہیں۔"[۲۴]

امام نسائی فرماتے ہیں: گویا علی ابن مدینی اسی کام (علل الحدیث) کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔[۲۵]

ابوحاتم رازی کا خیال ہے کہ "علی ابن مدینی حدیث اور علل حدیث کی معرفت میں سب سے آگے تھے۔"[۲۵]

مزاج

ابن معین فرماتے ہیں: "علی ابن مدینی جب ہمارے پاس (کوفہ) تشریف لاتے تو اہلِ سنت کے عقائد بیان کرتے اور جب بصرہ جاتے تو تشیع کا اظہار کرتے۔"[۲۶]

یہ واقعہ علی ابن مدینی کی شخصیت کے ایک اہم پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ کوفہ اپنے تشیع میں اور بصرہ اپنے عثمانی رجحانات کے لیے معروف تھا۔ غالباً اسی وجہ سے علی ابن مدینی تشیع کے مقام پر اہلِ سنت کے عقائد کا اظہار کرکے اور ناصبی مقام پر تشیع کا اظہار کرکے دونوں باہم برسرِپیکار رجحانات کی مخالفت کرتے تھے۔ اس سے ان کا مقصد غالباً دونوں فرقوں کی شدّت کو کم کرنا تھا۔

فتنۂ خلقِ قرآن

عباس بن عبدالعظیم عنبری کہتے ہیں کہ "ایک روز میں علی بن مدینی کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھیں خاموش اور غمگین پایا۔ میں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا "ایک خواب دیکھا ہے"۔ میں نے پوچھا وہ کیا؟ فرمایا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں حضرت داؤد علیہ السّلام کے منبر پر خطبہ دے رہا ہوں"۔ میں نے عرض کیا "خواب تو اچھا ہے۔ آپ ایک نبی کے منبر پر خطبہ دے رہے ہیں"۔ فرمایا "اگر میں خواب میں یہ دیکھتا کہ میں حضرت ایوب علیہ السّلام کے منبر پر خطبہ دے رہا ہوں تو بہتر ہوتا، کیوں کہ حضرت ایوب علیہ السّلام اپنے جسم کے معاملے میں آزمائش میں ڈالے گئے تھے۔ رہے حضرت داؤد علیہ السّلام تو ان کی آزمائش دین کے معاملے میں ہوئی تھی، مجھے یہ خوف دامن گیر ہوگیا ہے کہ میں بھی کہیں دین کے معاملے میں آزمائش میں نہ ڈالا جاؤں"۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔[۲۷] (یعنی وہ فتنۂ خلقِ قرآن کا شکار ہوگئے تھے۔)

تیسری صدی ہجری کے ربعِ اوّل میں امتِ مسلمہ کے درمیان ایک فتنہ یہ برپا ہوا کہ قرآن مخلوق ہے۔ حکومت اپنی پوری قوت و شوکت اور جلّادوں کے ساتھ اس فتنہ

کی پشت پناہی کر رہی تھی، جب کہ عام مسلمان اور قابل احترام علماء دوسری صف میں تھے۔ علماء اس فتنہ میں بڑی آزمائش میں ڈالے گئے، کچھ کو ایذاء و تعذیب کا نشانہ بنایا گیا اور کچھ کو قتل کر دیا گیا۔ اس آزمائش میں بعض علماء ثابت قدم رہے اور بعض سے کمزوری کا اظہار ہوا، کیوں کہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنے اور تکلیفیں برداشت کرنے میں تمام لوگ برابر نہیں ہوتے، کچھ آزمائش میں آخر تک جمے رہتے ہیں اور کامیابی سے ہم کنار ہوتے یا شہادت کا درجہ پاتے ہیں، کچھ لوگ ابتداء میں تو ثابت قدم رہتے ہیں لیکن کسی نہ کسی کمزوری کی وجہ سے آخر تک اس پر قائم نہیں رہ پاتے۔

فتنۂ خلق قرآن میں علی ابن مدینی کا موقف مؤخر الذکر لوگوں جیسا تھا۔ وہ اپنے بارے میں فرماتے ہیں: میرے لیے ان لوگوں کی بات مان لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، کیوں کہ مجھے ایک تاریک کوٹھری میں آٹھ ماہ تک قید رکھا گیا تھا۔ میرے پیر میں آٹھ من کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اتنی طویل قید سے مجھے اپنی بینائی ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو گیا تھا[۳۰]

مزید فرماتے ہیں" احمد بن حنبل میں کوڑا کھانے کی سکت تھی۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی[۳۱] وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے" مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ اگر مجھے ایک کوڑا بھی مارا جاتا تو میں مر جاتا[۳۲]

گذشتہ اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ علی ابن مدینی کے اندر قوت برداشت کم تھی، وہ نحیف الجثہ تھے ان کی جسمانی حالت اس قابل نہ تھی کہ ایذاء و تعذیب کو برداشت کر سکتے۔ اسی وجہ سے فتنۂ خلق قرآن کے سلسلہ میں انھوں نے حکومت وقت کی تائید کی اور ابن ابی دؤاد کے ہم نوا ہو گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابن ابی داؤد کو خوش کرنے کے لیے علی ابن مدینی لوگوں کو امام احمد بن حنبل کی احادیث سے دور رہنے کا حکم دیتے تھے۔ اسی طرح ابن ابی دؤاد بھی لوگوں کو اصمعی کی روایات سے دور رہنے کا حکم دیتے تھے، جنھوں نے ابن مدینی پر تنقید کی تھی[۳۳]

ابن مدینی ابن ابی دؤاد کو ابو عبداللہ کی کنیت سے پکارتے تھے[۳۴] اس وجہ سے اکثر لوگوں کو یہ وہم ہو گیا کہ اس کنیت سے مراد امام احمد بن حنبل ہیں[۳۵]

علی ابن مدینی پر بعض الزامات

حسن بن فہم نے اپنے والد سے بیان کیا ہے[۳۶] کہ خلیفہ معتصم کو ابن ابی دؤاد نے اس بات پر ابھارا کہ وہ امام احمد بن حنبل سے آخرت میں رویتِ باری تعالیٰ کے بارے میں دریافت کرے (ابن ابودؤاد کا خیال تھا کہ رؤیتِ باری ممکن نہیں اس لیے کہ آنکھ (نگاہ) کسی محدود شی پر ہی ٹکتی ہے جب کہ ذاتِ خداوندی لامحدود ہے) خلیفہ نے امام احمد سے سوال کیا تو انھوں نے حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ کی یہ حدیث پیش کی جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ "ایک مرتبہ ہم چودھویں رات کی چاندنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپ نے چاند کی طرف دیکھا اور فرمایا: سن لو تم عن قریب اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح اس روشن چاند کو دیکھ رہے ہو۔ اس کے دیدار میں کوئی چیز حائل نہ ہوگی"۔

یہ سن کر معتصم نے ابن ابی دؤاد سے پوچھا "اس حدیث کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" اس نے کہا اس حدیث کی سند پر غور کرتا ہوں۔ پھر اس نے علی بن مدینی کو بلا بھیجا — اس وقت وہ بغداد میں بہت مفلسی کی زندگی گزار رہے تھے — ابن مدینی اس کے پاس آئے تو اس نے ان سے کوئی بات کیے بغیر ان کی خدمت میں دس ہزار درہم پیش کیے اور کہا کہ یہ امیر المؤمنین کی طرف سے آپ کے لیے عطیہ ہے۔ مزید براں ابن ابی دؤاد نے حکومت کے کارندوں کو حکم دیا کہ انھیں جس چیز کی بھی ضرورت ہو، دی جائے۔ چنانچہ ان کو دو سال کی خوراک دے دی گئی۔ پھر ابن ابودؤاد نے ان سے پوچھا۔ اے ابوالحسن رؤیت باری تعالیٰ کے بارے میں حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ کی روایت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اس نے پھر کہا: کیا اس کے کسی ضعف کے بارے میں آپ کو علم ہے؟ انھوں نے کہا: اس طرح کی باتوں سے قاضی صاحب مجھ کو معاف رکھیں۔ ابن ابی دؤاد نے کہا: جناب یہ حالات حاضرہ کا ایک اہم موضوع ہے۔ پھر اس نے ان کے لیے بیش قیمت کپڑے، خوشبو اور سواری کا انتظام کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح ان پر ابن ابی دؤاد کی نوازشیں جاری رہیں، یہاں تک کہ انھیں کہنا

پڑا۔اس حدیث کی سند میں ایک راوی ناقابلِ اعتبار ہے،اس کی وجہ سے یہ روایت بھی ناقابلِ اعتبار ہے،وہ راوی قیس بن حازم ہے۔یہ ایک بدّو تھا جو اپنی ایڑیوں پر پیشاب کرتا تھا"(یعنی اس کو پیشاب کرنے کی تمیز نہ تھی)

دوسرے روز ابن ابی دؤاد نے علی ابن مدینی کی یہ بات خلیفہ معتصم کی مجلس میں بطور دلیل پیش کی،امام احمد بن حنبل نے جب یہ بات سنی تو فرمایا کہ یہ کام علی بن مدینی کا ہی ہو سکتا ہے۔

علامہ خطیب بغدادی نے اس الزام کو رد کیا ہے۔فرماتے ہیں" اللہ تعالیٰ نے علی ابن مدینی کو ایسا کہنے سے محفوظ رکھا تھا۔اس لیے کہ تمام محدثین بشمول علی ابن مدینی قیس بن ابی حازم کی روایت کو قبول کرنے پر متفق ہیں۔دوسرے یہ کہ جن حضرات نے امام احمد کی آزمائش کے واقعات بیان کیے ہیں ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں بیان کیا ہے کہ رؤیت کے مسئلہ پر امام احمد بن حنبل سے مناظرہ ہوا تھا۔اگر ابن فہم سے منقول یہ روایت صحیح ہے تو میرا خیال ہے کہ ابن ابی دؤاد نے قیس بن حازم کے بارے میں یہ بات خود ہی کہی ہے اور اس کی نسبت علی بن مدینی کی طرف کر دی ہے"[۳۵]

شاید علی بن مدینی کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ ابن ابی دؤاد کے شر سے محفوظ رہنے اور دوسرے بہت سے لوگوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کے پاس آتے جاتے تھے اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے[۳۶] اسی وجہ سے علی بن مدینی پر بعض دوسرے الزامات بھی عائد کیے گئے ہیں۔امام ذہبی نے ان کی صرف اتنی ہی گرفت کی ہے[۳۷] اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ علماء نے ان کی تعریف وتحسین کی ہے اور خلقِ قرآن کے مسئلہ میں انھیں معذور سمجھا ہے۔ابن معین فرماتے ہیں:" وہ ڈر گئے تھے، اسی بنا پر ایسی بات کہہ دی تھی"

ابن رجب اس عذر سے مطمئن نہیں تھے،چنانچہ ان کا قول ہے" اگر بات اتنی ہی ہوتی جتنی بیان کی جاتی ہے تو ان کا عذر قابلِ قبول ہوتا،بلکہ معاملہ اس سے زیادہ افسوسناک تھا جیسا کہ ہم نے بیان کیا"[۳۸]

ابن ابو حاتم رازی فرماتے ہیں:فتنۂ خلقِ قرآن میں علی ابن مدینی کے موقف کی وجہ سے ابو زرعہ نے ان سے روایت کرنا بند کر دیا تھا،لیکن میرے والد ان سے روایت

کرتے تھے، اس لیے کہ بعد میں انھوں نے اپنے سابقہ موقف سے رجوع کر لیا تھا[۴۳۹]

ذہبی فرماتے ہیں: اس امام کے مناقب بہت ہیں اگر انھوں نے مسئلہ خلقِ قرآن میں ملوّث ہو کر اس کو مکدّر نہ کر دیا ہوتا یا احمد بن ابی دؤاد کے پاس ان کا آنا جانا نہ ہوتا، لیکن ابن مدینی نے بعد میں اپنے سابقہ موقف سے رجوع کر لیا تھا اور اس پر شرمندہ تھے اور قرآن کو مخلوق قرار دینے والے کو کافر گردانتے تھے، اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے اور ان کی مغفرت کرے[۴۴۰]

علامہ سبکی فرماتے ہیں: "ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ انھوں نے تلوار کے خوف سے ایسی بات کہی تھی"[۴۴۱]

محمد بن عبداللہ عمار فرماتے ہیں: "علی ابن مدینی کے بارے میں ہم بغیر کسی شک و شبہہ کے کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ کہا تلوار کے خوف سے کہا۔ اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ حکومت کی مرضی کے خلاف کہنے پر وہ اس کی آزمائشوں کو جھیل نہیں سکیں گے"[۴۴۲]

امام بخاری نے ان سے تین سو حدیثیں روایت کی ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ انھیں ابن مدینی پر پورا اعتماد تھا[۴۴۳]

امام علی ابن مدینی کی برارت، فنِ حدیث میں ان کی عظمت اور ان کی عدالت و ثقاہت ثابت کرنے کے لیے علماء کے مذکورہ بالا اقوال کافی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مسئلہ خلقِ قرآن میں علی ابن مدینی کا عقیدہ بالکل صحیح تھا۔ انھوں نے جو کچھ کہا وہ جان کے ڈر سے کہا تھا۔ انھوں نے ایک مرتبہ علی بن حسین بن ولید سے فرمایا: "میرے بارے میں میرے اصحاب کو بتا دو کہ خلقِ قرآن کے قائلین کافر اور گمراہ ہیں۔ میں نے مجبوراً ان کی تائید کی تھی"[۴۴۴] اس مسئلہ میں ان سے ایک اور صریح قول بھی مروی ہے۔

محمد بن عثمان بن ابو شیبہ کا بیان ہے کہ میں نے علی ابن مدینی کو ان کی موت سے دو ماہ قبل یہ فرماتے ہوئے سنا ہے "جو شخص قرآن کو مخلوق کہے وہ کافر ہے"[۴۴۵]

وفات

علی ابن مدینی کا انتقال مقام عسکر میں بروز پیر مورخہ ۲۸ ذی قعدہ ۲۳۴ھ کو ہوا[۴۴۶]

(علی ابن مدینی کی کتاب "العلل" پر محقق ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی کا مقدمہ)

مراجع

(۱) ابویعلی خلیلی : الارشاد، مکتبہ ایا صوفیا، استنبول، مخطوطہ ۲۹۵۱ صـ ۱۰۰-أ

(۲) کارل بروکلمان : تاریخ ادب العرب (عربی ترجمہ) دارالمعارف قاہرہ طبع دوم ۱۹۶۸ء ج ۳ ص ۲۲۰-۲۲۱

(۳) خطیب بغدادی : تاریخ بغداد، قاہرہ ۱۹۳۱ء، ج ۱۱

(۴) محمد بن اسماعیل بخاری : التاریخ الکبیر، حیدرآباد ۱۳۶۱ھ، ج ۳/۲ ص ۲۸۴

(۵) ذہبی : تذکرۃ الحفاظ، حیدرآباد ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۵ء، ص ۴۲۸-۴۲۹

(۶) ابن حجر عسقلانی : تہذیب التہذیب، حیدرآباد ۱۳۲۵ھ، ج ۷، ص ۳۴۹

(۷) مزّی : تہذیب الکمال، دارالکتب المصریہ قاہرہ، ص ۴۹۰

(۸) خطیب بغدادی : الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع، مکتبہ البلدیہ اسکندریہ، ص ۱۹۵-أ

(۹) ابن ابی حاتم رازی : الجرح والتعدیل، حیدرآباد ۱۳۶۰ھ، ج ۱/۳ ص ۱۹۴

(۱۰) قیسرانی : الجمع بین رجال الصحیحین، ص ۳۵۶

(۱۱) ابن عماد حنبلی : شذرات الذہب، قاہرہ ۱۳۵۰ھ، ج ۲ ص ۸۱

(۱۲) ابن رجب حنبلی : شرح علل الترمذی، احمد الثالث (۵۳۲ھ) ص ۴۸ق - ۵۰ق

(۱۳) ابویعلیٰ موصلی : طبقات الحنابلہ، مطبعۃ السنۃ المحمدیہ قاہرہ، ج ۱ ص ۲۲۶-۲۲۷

(۱۴) سبکی : طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، تحقیق عبدالفتاح، قاہرہ ۱۳۸۳ھ، ج ۲ ص ۱۴۵

(۱۵) ابن خیر اشبیلی : الفہرست، بغداد ۱۹۶۳ء، ص ۲۲۵-۲۲۶

(۱۶) ابن ندیم : الفہرست، تحقیق فلوجل، لیپزج ۱۸۷۱ء، ص ۲۳۱

(۱۷) حاکم نیشاپوری : معرفۃ علوم الحدیث، تحقیق معظم حسین، قاہرہ ۱۹۳۷ء، ص ۷۱

(۱۸) ذہبی : میزان الاعتدال، تحقیق بجاوی قاہرہ ۱۳۸۲ھ، ج ۳ ص ۱۳۸

(۱۹) تغری بردی : النجوم الزاہرہ، دارالکتب المصریہ قاہرہ، ج ۲ ص ۲۷۷

حواشی

۱ تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۴۵۹

۲ عبداللہ بن جعفر سعدی کی سوانح حیات کے لیے ملاحظہ ہو : تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۱۷۴-۱۷۶

۳ھ تہذیب الکمال ص ۴۹۰ ۔أ۔ نیز تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۴۶۲

۴ھ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۱

۵ھ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۸۲

۶ھ تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۴۶۱

۷ھ الارشاد ص ۱۰۰ ۔أ

۸ھ تاریخ بغداد جلد ۱۱ ص ۴۶۲

۹ھ الطبقات الکبری ج ۲ ص ۱۴۵

۱۰ھ المیزان ج ۳ ص ۱۴۱، مزید دیکھئے النجوم الزاہرہ ج ۲ ص ۲۷۷

۱۱ھ الفہرست ص ۲۳۱

۱۲ھ فہرست ابن خیر اشبیلی ص ۲۲۵

۱۳ھ معرفۃ علوم الحدیث ص ۷۱ ۔ ۷۲، مزید دیکھئے خطیب بغدادی، الجامع ص ۱۹۵ ۔ أ، ابن رجب، شرح علل الترمذی ص ۴۸ ب

۱۴ھ الجامع ص ۱۹۵ ۔ أ

۱۵ھ یہ پوری بحث اختصار کے ساتھ تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۱۷۴ ۔ ۱۷۶ سے منقول ہے۔

۱۶ھ ملاحظہ ہو: میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۴۱

۱۷ھ الجامع ص ۱۹۵ ۔ أ

۱۸ھ تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۴۶۳

۱۹ھ ایضاً، مزید دیکھئے شرح علل الترمذی ص ۴۸ ۔ أ، نیز تذکرۃ الحفاظ ص ۴۲۸

۲۰ھ الجرح والتعدیل ج ۳ ص ۱۹۴، مزید دیکھیں تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۴۵۸ ۔ ۴۵۹

۲۱ھ تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۴۶۰، تذکرۃ الحفاظ ص ۴۲۸

۲۲ھ تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۴۶۰ ۲۳ھ حوالہ بالا ص ۴۶۵

۲۴ھ محولہ بالا ص ۴۶۴، تذکرۃ الحفاظ ص ۴۲۸

۲۵ھ تذکرۃ الحفاظ ص ۴۲۸

۲۶ھ الجرح والتعدیل ج ۳/۱ ص ۱۹۴، شرح علل الترمذی ص ۴۸ ۔ أ

۲۷ھ تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۴۶۳، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۳۹

۲۸ھ تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۴۶۵ - ۴۶۶

۲۹ھ حوالہ بالا ج ۱۱ ص ۴۷۱ ۳۰ھ ایضاً ص ۴۶۹

۳۱ھ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۴۱

۳۲ھ تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۴۷۰ - ۴۷۱

۳۳ھ حوالہ بالا ۳۴ھ حوالہ بالا ج ۱۱ ص ۴۶۶

۳۵ھ حوالہ بالا ج ۱۱ ص ۴۶۷ ۳۶ھ حوالہ بالا ج ۱۱ ص ۴۷۱

۳۷ھ تذکرۃ الحفاظ ص ۴۲۸

۳۸ھ شرح علل الترمذی ص ۴۹ - ۵۰

۳۹ھ الجرح والتعدیل ج ۳/۱ ص ۱۹۴

۴۰ھ تذکرۃ الحفاظ ص ۴۲۸

۴۱ھ طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۷

۴۲ھ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۴۱

۴۳ھ تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۵۷

۴۴ھ تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۴۷۱

۴۵ھ شرح علل الترمذی ص ۴۹ - ۵۰، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۴۱، ابن المدینی: سوالات محمد بن عثمان بن ابی شیبہ ص ۲۲۲ - ۲۲۳، مزید دیکھئے مقبلی: العلم الشامخ، قاہرہ، ۱۳۲۸ھ، طبع اول، ص ۳۰۴

۴۶ھ تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۴۷۳، قیسرانی: الجمع بین رجال الصحیحین ص ۳۵۶، بخاری التاریخ الکبیر ج ۳/۲ ص ۲۸۴

خطیب نے تاریخ وفات کے سلسلہ میں ایک دوسرا قول ۲۳۵ھ کا نقل کیا ہے۔ خلیلی نے الارشاد ص ۱۰۰ میں ان کا سن وفات ۲۳۸ھ تحریر کیا ہے۔ فہرست ابن ندیم ص ۲۳۱ میں ہے کہ ان کی وفات سامرا میں ۲۵۸ھ میں ہوئی۔ یہ کھلی تصحیف ہے۔

تعارف وتبصرہ

الرای الصحیح فی من ھو الذبیح

الامام عبدالحمید الفراہی

دارالقلم دمشق، طبع اول ۱۹۹۹ء، صفحات ۱۶۴

زیرِ نظر کتاب مولانا فراہیؒ صاحبِ تفسیر نظام القرآن (م ۱۹۳۰ء) کی مشہور اور اہم تصانیف میں سے ہے۔ یہ مولانا کی حیات میں ہی ۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹ء) میں مطبعۃ معارف اعظم گڑھ سے طبع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکی تھی۔ ۱۴۱۴ھ (۱۹۹۴ء) میں اس کا دوسرا ایڈیشن دائرۃ حمیدیہ سرائے میر سے شائع ہوا تھا۔ اب عالم عرب کے مشہور اشاعتی ادارہ دارالقلم دمشق سے اس کا تیسرا ایڈیشن دیدہ زیب طباعت کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کس بیٹے کو راہِ خدا میں ذبح کیے جانے کا حکم دیا گیا تھا؟ اس مسئلہ میں ابتدا ہی سے علمائے اسلام میں اختلاف رہا ہے۔ مولانا فراہی نے اس موضوع پر بڑی معرکہ آرا بحث کی ہے۔ انھوں نے حضرت اسماعیلؑ کے ذبیح ہونے پر بائبل اور قرآن سے تیرہ دلیلیں دی ہیں۔ آخر میں صحابہ و تابعین اور سلف سے مروی مختلف روایات اور مفسرین اور علمائے سلف کے اختلافات کا تجزیہ کیا ہے۔

اس کتاب کا محقق ایڈیشن ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی نے تیار کیا ہے۔ اس میں آیات، احادیث، اشعار، اعلام و اماکن اور مراجع وغیرہ کی فہرستیں بھی دی گئی ہیں۔ فاضل محقق نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس موضوع پر کتبِ تفسیر و تاریخ میں ضمنی بحث کے علاوہ مستقل رسالے بھی تصنیف کیے گئے ہیں۔ مثلاً کتاب الاختلاف فی الذبیح من ہو؟ (مکی بن ابی طالب القیسی م ۴۳۷ھ) تبیین الصحیح فی تعیین الذبیح (قاضی ابوبکر ابن العربی م ۵۴۳ھ) القول الصحیح فی تعیین الذبیح (تقی الدین سبکی م ۷۵۶ھ) القول الفصیح فی تعیین الذبیح (سیوطی م ۹۱۱ھ) الیمون التصریح بمضمون الذبیح (ابن طولون م ۹۵۳ھ) القول المليح فی تعیین الذبیح (علی بن برہان الدین الحلبی م ۱۰۴۴ھ) وغیرہ۔ البتہ یہ رسالے بہت مختصر تھے۔ مولانا فراہی کی یہ کتاب اس موضوع پر

ایک مبسوط کتاب ہے۔ علامہ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ حضرت اسحاقؑ کو ذبیح قرار دینا بیس سے زائد وجوہ سے غلط ہے (موسسۃ الرسالۃ بیروت ۱۳۹۹ھ، ۱/۱۷) زیر نظر کتاب اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ خاص طور سے بائبل سے مستنبط دلائل اہم ہیں کیونکہ متقدمین نے ان میں سے صرف دو ایک دلیلیں ہی پیش کی ہیں۔

اس کتاب کا اردو ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے کیا تھا، جو دائرۂ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڑھ سے شائع شدہ ہے۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

علوم الحدیث ۔ مطالعہ وتعارف

مرتب: رفیق احمد رئیس سلفی

ناشر: مقامی جمعیت اہل حدیث، سول لائنس، سلفیہ کامپلکس، ہمدرد نگر، علی گڑھ یوپی ۲۰۲۰۰۲

سن اشاعت: نومبر ۱۹۹۹ء صفحات ۵۲۸ (بڑی تقطیع) قیمت مجلد ۲۰۰ روپے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل اور تقریر کو حدیث اور اس کی صحت و عدم صحت کو جانچنے اور پرکھنے کو علم حدیث کہتے ہیں۔ حدیث چونکہ شریعت اسلامیہ کا ایک بنیادی ماخذ ہے اس لیے علم حدیث کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے تاکہ شرعی احکام پر پورے اطمینان وشرح صدر کے ساتھ عمل کیا جا سکے۔ علم حدیث شروع سے علمائے اسلام کا موضوع بحث رہا ہے چنانچہ اس کے ایک ایک شعبہ میں ان کی بیش بہا خدمات موجود ہیں۔ موجودہ دور میں حدیث سے متعلق بعض شکوک وشبہات وارد کیے جاتے ہیں۔ اس کے پیش نظر ضرورت تھی کہ ان علوم وفنون کا تعارف کرا دیا جائے جن کی بنیاد پر حدیث کو حجت تسلیم کیا جاتا ہے اور جن سے ناواقفیت کی وجہ سے اس پر اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب اس ضرورت کی تکمیل کی ایک اچھی کوشش ہے۔

۱۹۹۸ء میں علی گڑھ میں مقامی جمعیت اہل حدیث کے زیر اہتمام "علوم الحدیث" کے موضوع پر ایک سمینار ہوا تھا۔ یہ کتاب اس سمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ ان مقالات کے موضوعات یہ ہیں: حدیث کی تشریعی حیثیت، تدوین حدیث، طبقات رجال، روایت ودرایت، حدیث مرسل، خبر واحد، احادیث ضعیفہ، کتب سیرت میں غیر مستند روایات، ظن۔ اصول حدیث کی ایک اہم تعبیر، نصوص قرآن وسنت اور فقہی تصنیفات، صحابہ کرامؓ اور احادیث

رسولؐ، تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے۔ ائمہ کتبِ ستہ کی شروط، تخریج حدیث، ضوابطِ جرح وتعدیل، انکارِ سنت اور علم وفہم کے تقاضے، برصغیر میں فتنۂ انکارِ حدیث، حدیثِ نبوی اور مستشرقین، امام بخاری اور ان کی فقاہت، مرعاۃ المفاتیح اور اس کے مؤلف، جامع ترمذی کی تین شروح، سننِ ابی داؤد کی تین شروح، بلوغ المرام، آثار السنن اور اعلاء السنن، علمائے اہل حدیث کی خدماتِ حدیث، مدرسہ فیض عام مئو کی خدماتِ حدیث اور ابنائے جامعہ عالیہ عربیہ مئو کی خدماتِ حدیث۔

یہ مجموعہ علوم الحدیث پر ایک عمدہ پیش کش ہے، اس کے سبھی مقالات اہم ہیں اور حدیث اور علم حدیث سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس میں کافی مواد ہے۔ خصوصاً اس کے بعض مقالات مثلاً تدوینِ حدیث، طبقاتِ رجال، روایت ودرایت، حدیثِ مرسل احادیثِ ضعیفہ اور ائمہ کتبِ ستہ کی شروط کا جائزہ، اردو زبان میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مختلف کتبِ احادیث کی شرحوں کا تقابلی مطالعہ بھی اپنی نوعیت کی ایک اہم چیز ہے۔ تمام مقالات کی تیاری میں اصل مآخذ ومراجع سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کتابت اور طباعت بہت عمدہ اور نفیس ہے۔

اس مجموعہ کو گرچہ مکمل اور جامع بنانے کی کوشش کی گئی ہے مگر اس میں بعض کمیاں اور خامیاں بھی رہ گئی ہیں۔ مثال کے طور پر حدیث کا تعلق محض علوم وفنون سے نہیں ہے بلکہ عملی زندگی سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے، شرعی احکام کی بیشتر تفصیلات حدیث ہی میں ملتی ہیں، کتبِ حدیث کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام محدثین نے احادیث کو ایک مکمل نظامِ حیات کی شکل میں پیش کیا ہے۔ مثلاً صحاح ستہ کی ترتیب وتبویب میں کتاب الایمان سے لے کر کتاب الآداب تک زندگی کے تمام شعبوں اور ان کا ایک ایک جزو بیان ہوا ہے۔ زیرِ تبصرہ مجموعہ میں اس پہلو پر روشنی ڈالنے والا کوئی مقالہ شامل نہیں ہے، حالانکہ موجودہ دور میں جبکہ لوگ خود ساختہ نظام ہائے زندگی ترتیب دے رہے ہیں، اس کی شدید ضرورت ہے۔

ہندوستان میں منکرینِ حدیث کی فہرست میں جن لوگوں کا نام لیا جاتا ہے ان میں سرسید احمد خاں بھی ہیں۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی ہونے کے علاوہ ایک صاحبِ طرز مصنف بھی تھے تفسیر، سیرت اور تاریخ پر ان کی بیش قیمت تصنیفات موجود ہیں۔ سیرت پر

ان کی کتاب خطباتِ احمدیہ خصوصی اہمیت کی حامل ہے جس میں انھوں نے احادیث سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان کے بارے میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ وہ مسلکاً اہلِ حدیث تھے، ایسی صورت میں ان کی طرف انکارِ حدیث کی نسبت کرنے سے پہلے ان کی تحریروں کا تجزیہ کرنا چاہیے، رواروی میں کسی پر انکارِ حدیث کا حکم لگا دینا نہ مناسب ہے اور نہ کوئی دینی خدمت ہے۔ اسی طرح بعض دیگر اہم شخصیات (مثلاً علامہ شبلی نعمانی اور مولانا مودودی) کی طرف بھی شک و شبہ کی انگلی اٹھائی جاتی ہے جن کی نہ صرف اسلامیات میں ناقابلِ فراموش خدمات ہیں بلکہ جو زندگی بھر حدیث کا بھرپور دفاع کرتے رہے ہیں۔ اس کا بھی غیر جانبدارانہ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

سب ہی مقالات کا موضوع گرچہ علمی ہے تاہم ان کی زبان و بیان یکساں نہیں ہے بعض مقالوں میں تقریری لب و لہجہ غالب ہے۔ بعض میں عربی اقتباسات کے ترجمے نہیں ہیں بعض مقالات سمینار کے موضوع سے ہٹے ہوئے ہیں۔ ان کمیوں کے باوجود اس موضوع پر سمینار کا انعقاد اور اس کے مقالات کی ترتیب و اشاعت قابلِ ستائش ہے۔ اس کی پذیرائی ہونی چاہیے۔ (محمد جہیں کریمی)

سہ ماہی "حرا" حیدرآباد

مدیر: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

پتہ: المعہد العالی الاسلامی ۱۲/۱۴۱-۲-۱۶۔ نزد عیدگاہ اجالے شاہ، اکبر باغ، ملک پیٹ، حیدرآباد ۳۶

صفحات شمارہ اول ۱۱۲، دوم ۱۲۰۔ از خریداری فی شمارہ -/۳۰ سالانہ =/۱۰۰

اسلامک فقہ اکیڈمی کے سکریٹری اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے تاسیسی رکن مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اپنی فقہی بصیرت اور علمی و دینی خدمات کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ ایک عرصہ تک جنوبی ہند کی مشہور درس گاہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد اب انھوں نے حیدرآباد ہی میں المعہد العالی الاسلامی کے نام سے اعلیٰ دینی تعلیم کا ایک ادارہ قائم کیا ہے۔

اس ادارہ کے ترجمان کے طور پر سہ ماہی "حرا" کا اجرا جنوری ۲۰۰۰ء سے عمل میں آیا ہے۔ اس کے اولین دو شمارے پیشِ نظر ہیں جو ماشاء اللہ علمی و تحقیقی مضامین پر مشتمل ہیں۔

امید ہے مولانا رحمانی کی سربراہی میں یہ ادارہ اور ان کی ادارت میں یہ مجلہ خوب ترقی کرے گا اور امت کے باشعور طبقے میں اس کی پذیرائی ہوگی۔ (م۔ر۔ن)

خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی

۱۔ انتہائی افسوس اور رنج کے ساتھ یہ خبر دی جارہی ہے کہ ادارہ کے سابق رکن ڈاکٹر منور حسین فلاحی (پ ۱۹۵۹ء) کا ۱۷ اور ۱۸ ستمبر کی درمیانی شب میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم نے جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ سے عالمیت (۱۹۷۴ء) وفضیلت (۱۹۷۶ء) اور اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے (۱۹۸۲ء) ایم اے اردو (۱۹۸۶ء) اور پی ایچ ڈی (۱۹۹۲ء) کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ اگست ۱۹۹۱ء سے دسمبر ۱۹۹۴ء تک وہ ادارۂ تحقیق سے وابستہ رہے، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرر مقرر ہوگئے تھے۔ ادارہ سے ان کا غیر رسمی تعلق اس کے بعد بھی برقرار رہا۔ وہ مختلف خدمات انجام دینے کے ساتھ خصوصاً تحقیقاتِ اسلامی کی ترتیب میں مدیر محترم کا تعاون کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت کرے اور ان کے پس ماندگان کا دنیا وکارساز ہو۔ معاونت کا یہ کام اب ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی انجام دے رہے ہیں۔

۲۔ سکریٹری ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کی متعدد کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوچکے ہیں۔ گزشتہ دنوں اسلام اور وحدتِ بنی آدم اور خدا کی غلامی انسان کی معراج کا مراٹھی اور تلگو میں ترجمہ ہوا ہے۔ اسلام کی دعوت ان کی مقبول کتابوں میں سے ہے۔ اس کا تلگو میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ اس کتاب پر نظر ثانی کا کام جاری ہے۔ مصنف نے اس میں خاطر خواہ اضافے کیے ہیں۔ نظر ثانی اور اضافہ شدہ مواد کا کنڑ زبان میں ترجمہ ہورہا ہے۔

۳۔ ادارہ کے رکن مولانا محمد جرجیس کریمی کی ایک کتاب "تفہیماتِ قرآن" ادارۂ خدمتِ خلق، ڈابھا کینڈ دمکا جھارکھنڈ نے شائع کی ہے، اس میں آزمائش، صبر، جزا وسزا اور فلاح کے قرآنی تصورات شیطان کے ارادے، قلب کی روحانی بیماریاں، اصلاحِ نفس کے ذرائع، قرآن میں حیوانی تمثیلات کا مقصد جیسے موضوعات زیر بحث آئے ہیں، یہ کتاب مکتبہ تحقیق وتصنیفِ اسلامی سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ صفحات ۱۰۶، قیمت ۴۰ روپے۔

۴۔ متعدد موضوعات پر کارکنانِ ادارہ کی تیار کردہ کتابیں منتظرِ اشاعت ہیں۔ مثلاً اسلامی ریاست اور انسانی حقوق از مولانا سید جلال الدین عمری۔ اسلام اور آزادیٔ فکر وعمل از مولانا سلطان احمد اصلاحی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، مطالعہ سیرت از ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی۔ اسلام میں انسدادِ جرائم کی تدابیر اور علاج، عقیدۂ توحید اور عدل کا قیام از مولانا محمد جرجیس کریمی۔ اہلِ خیر حضرات کی توجہ اور تعاون سے ان کی اشاعت کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ (ادارہ)

۴۷۶

فہرست مقالات سہ ماہی تحقیقات اسلامی سنہ ۲۰۰۰ء

مقالہ	مقالہ نگار	شمارہ	صفحات
حرفِ آغاز			
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور کے بعض اہم واقعات	سید جلال الدین عمری	۱	۵ — ۳۴
" (۲)	"	۲	۱۲۵ — ۱۴۳
" (۳)	"	۳	۲۴۵ — ۲۶۴
ہجرتِ حبشہ	"	۴	۳۶۵ - ۳۹۰
تحقیق و تنقید			
اسرار الفاتحہ - ایک تعارف	پروفیسر کبیر احمد جائسی	۱	۳۵ — ۶۵
انگریزی عہد میں اسلامی تہذیب	ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی	۱	۶۶ — ۸۷
نقدِ حدیث - ضرورت و ماہیت	ڈاکٹر خالد ظفر اللہ داؤدی	۲	۱۴۴ — ۱۶۶
آراضیٔ ہند کی شرعی حیثیت - ایک تاریخی جائزہ	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۳	۲۶۵ - ۲۸۲
اردو تاریخ نویسی کا ایک جائزہ - عہدِ سرسید تک	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۳	۲۸۳ — ۳۱۵
تخریجِ احادیث - ایک تعارف	حافظ افتخار احمد	۴	۳۹۱ - ۴۰۵
آثار البلاد - فنِ تراجم کا ایک اہم ماخذ	جمشید احمد ندوی	۴	۴۰۶ - ۴۱۸
بحث و نظر			
نصابِ زکوٰۃ کی تعیین - چند اصولی مباحث	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۱	۸۸ — ۹۷
رسولِ کریمؐ کی ازدواجی زندگی - اعتراضات کا جائزہ	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲	۱۶۷ — ۱۹۵
قرائنی شہادت کی شرعی حیثیت اور عصرِ حاضر کے تناظر میں اس کی اہمیت	ڈاکٹر سید ازکیا ہاشمی	۳	۳۱۷ — ۳۳۶
حالتِ نشہ کی طلاق	مولانا ولی اللہ مجید قاسمی	۴	۴۱۹ - ۴۳۱
سیر و سوانح			
شیخ حسن البناؒ - اسلامی بیداری کے سرخیل	پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی	۲	۱۹۶ — ۲۳۰
محمد مرماڈیوک ولیم پکتھال اور اسلام	پروفیسر اقتدار حسین صدیقی	۳	۳۳۷ - ۳۵۰

ترجمہ وتلخیص

احادیث اور اقوالِ ائمہ میں تعارض کے اسباب	علامہ ابن تیمیہؒ / مترجم مولانا الطاف احمد اعظمی	۱	۹۸ - ۱۱۸
سیرت نگاری کی تاریخ پر ایک نظر	مصطفیٰ السقا، ابراہیم الابیاری، عبدالحفیظ شلبی / مترجم ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۴	۴۳۲-۴۵۶
علی ابن مدینی - احوال اور علمی آثار	ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی / مترجم: مولانا محمد اسلام عمری	۴	۴۵۷-۴۷۱

تعارف وتبصرہ

شیر زبازار میں سرمایہ کاری (ڈاکٹر عبدالعظیم اسلامی)	ڈاکٹر ولید احمد انصاری	۲	۲۳۱-۲۳۳
خدمتِ خلق یا حقوق العباد (عبداللہ دانش)	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲	۲۳۳-۲۳۴
تذکرۂ حیوانات قرآنِ کریم میں (ڈاکٹر میر گوہر علیؒ)	"	۳	۳۵۱-۳۵۳
احادیث "لیس منا" (مولانا محمد فاروق خاں)	"	۳	۳۵۳-۳۵۵
اسلامی معاشیات (ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی)	"	۳	۳۵۵-۳۵۶
امتِ مسلمہ - رہبر اور رہنمائی امت (مولانا سید محمد رابع حسنی)	"	۳	۳۵۶-۳۵۷
قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں کے سائنسی کارنامے (ڈاکٹر غلام قادر لون)	مولانا محمد جرجیس کریمی	۳	۳۵۷-۳۶۰
الرای الصحیح فی من ھو الذبیح (مولانا فراہیؒ)	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۴	۴۷۲-۴۷۳
سہ ماہی "حرا" حیدرآباد (خالد سیف اللہ)	"	۴	۴۷۵ -
علوم الحدیث - مطالعہ وتعارف (رفیق احمد سلفی)	مولانا محمد جرجیس کریمی	۴	۴۷۳-۴۷۵
خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۱)	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۱	۱۱۹ - ۱۲۰
" (۳)	"	۴	۴۷۶ - ×
" (۲)	سید جلال الدین عمری	۲	۲۳۵ - ۲۴۰

فہرست مقالہ نگاران تحقیقاتِ اسلامی ۲۰۰۰ء

مقالہ نگار	مقالہ	شمارہ	صفحات
ابراہیم الابیاری	سیرت نگاری کی تاریخ پر ایک نظر	۴	۴۳۲ - ۴۵۶
ابن تیمیہؒ	احادیث اور اقوالِ ائمہ میں تعارض کے اسباب	۱	۹۸ — ۱۱۸
افتخار احمد، حافظ	تخریجِ احادیث - ایک تعارف	۴	۳۹۱ - ۴۰۵

الیاس الاعظمی، محمد	اردو تاریخ نویسی کا ایک جائزہ (عہدِ سرسید تک)	۳		۲۸۳-۳۱۵
انصاری، ولید احمد	شیر زبازار میں سرمایہ کاری (تبصرہ)	۲		۲۳۱-۲۳۳
جائسی، کبیر احمد	اسرار الفاتحہ — ایک تعارف	۱		۳۵-۶۵
داؤدی، خالد ظفر اللہ	نقدِ حدیث۔ ضرورت و ماہیت	۲		۱۴۴-۱۶۶
شبلی، عبدالحفیظ	سیرت نگاری کی تاریخ پر ایک نظر	۴		۴۳۲-۴۵۶
صدیقی، اقتدار حسین	محمد مرماڈیوک پکتھال اور اسلام	۳		۳۳۷-۳۵۰
صدیقی، محمد یسین مظہر	آراضیٔ ہند کی شرعی حیثیت۔ ایک تاریخی جائزہ	۳		۲۶۵-۲۸۲
"	نصابِ زکوٰۃ کی تعیین۔ چند اصولی مباحث	۱		۸۸-۹۷
عمری، سید جلال الدین	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور کے بعض اہم واقعات[1]	۱		۵-۳۴
"	"	۲	(۲)	۱۲۵-۱۴۳
"	"	۳	(۳)	۲۴۵-۲۶۴
"	ہجرت حبشہ	۴		۳۶۵-۳۹۰
"	خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی	۲		۲۳۵-۲۴۰
عمری، محمد اسلام	علی ابن مدینی۔ احوال اور علمی آثار (ترجمہ)	۴		۴۵۷-۴۷۱
قاسمی، محمد سعود عالم	انگریزی عہد میں اسلامی تہذیب	۱		۶۶-۸۷
قاسمی، ولی اللہ مجید	حالتِ نشہ کی طلاق	۴		۴۱۹-۴۳۱
کریمی، محمد جرجیس	قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں کے سائنسی کارنامے (تبصرہ)	۳		۳۵۷-۳۶۰
"	علوم الحدیث۔ مطالعہ و تعارف	۴	(۰۰)	۴۷۳-۴۷۵
ملاباتی، الطاف احمد	احادیث اور اقوالِ ائمہ میں تعارض کے اسباب (ترجمہ)	۱		۹۸-۱۱۸
مصطفیٰ اعظمی، محمد	علی ابن مدینی — احوال اور علمی آثار	۴		۴۵۷-۴۷۱
مصطفیٰ السقا	سیرت نگاری کی تاریخ پر ایک نظر	۴		۴۳۲-۴۵۶
ندوی، جمشید احمد	آثار البلاد۔ فن تراجم کا ایک اہم مآخذ	۴		۴۰۶-۴۱۸
ندوی، محمد رضی الاسلام	رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی۔ اعتراضات کا جائزہ	۲		۱۶۷-۱۹۵
"	سیرت نگاری کی تاریخ پر ایک نظر (ترجمہ)	۴		۴۳۲-۴۵۶
"	خدمتِ خلق یا حقوق العباد (تبصرہ)	۲		۲۳۳-۲۳۴
"	تذکرۂ حیوانات قرآن کریم میں	۳	(۰)	۳۵۱-۳۵۳

"	احادیث "لیس منا" (تبصرہ)	۳	۳۵۳-۳۵۵
"	اسلامی معاشیات (")	۳	۳۵۵-۳۵۶
"	امتِ مسلمہ۔ رہبر اور مثالی امت (")	۳	۳۵۶-۳۵۷
"	الرای الصحیح فی من ھوالذبیح (")	۴	۴۷۲-۴۷۳
"	سہ ماہی "حرا" حیدرآباد (")	۴	۴۷۵ - ×
"	خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی	۱	۱۱۹ - ۱۲۰
"	خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی	۴	۴۷۶ - ×
ندوی، مسعود الرحمٰن خاں	شیخ حسن البنا۔ اسلامی بیداری کے سرخیل	۲	۱۹۶ - ۲۳۰
ہاشمی، سید ازکیا	قرآنی شہادت کی شرعی حیثیت اور عصرِ حاضر	۳	۳۱۷-۳۳۶
	کے تناظر میں اس کی اہمیت	۳	۳۱۷-۳۳۶

تصنیفی تربیت کا زرّیں موقع

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی علی گڑھ اپنے زمانۂ تاسیس ہی سے بحث وتحقیق کے ساتھ نوخیز اہلِ قلم کو اسلامی موضوعات پر تصنیف وتالیف کی تربیت بھی فراہم کرتا ہے۔ اس شعبہ سے فائدہ اٹھا کر بہت سے حضرات آج ملک وبیرونِ ملک میں اہم علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس دو سالہ تربیتی کورس کے لیے انتخاب انٹرویو کی بنیاد پر ہوگا منتخب ہونے والے افراد کو ادارہ کی نئی اور کشادہ عمارت میں قیام کی سہولت کے ساتھ ایک ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ بھی دیا جائے گا۔

مطلوبہ اہلیت: (۱) درخواست دہندہ کسی کالج یا یونیورسٹی سے ایم۔اے ہو اور اسلامیات اور عربی کی اچھی استعداد رکھتا ہو یا (۲) کسی معروف عربی مدرسہ سے فضیلت یا اس کے مساوی کا حامل ہو اور ہائی اسکول کے معیار کی انگریزی کی صلاحیت رکھتا ہو۔

درخواست کے ساتھ حسبِ ذیل معلومات فراہم کی جائیں:

(۱) نام (۲) عمر (۲۵ سال سے زیادہ نہ ہو) (۳) پورا پتہ (۴) تعلیمی استعداد (اسناد و مارکس شیٹ کی نقول کے ساتھ) (۵) کورس کے مطالعہ کی تفصیل (۶) مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مضامین کی نقول (۷) دلچسپی کے موضوعات کی تفصیل (۸) تحریکِ اسلامی سے متعلق یا کسی معروف شخصیت کا تصدیق نامہ۔

جن افراد کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا انھیں ایک طرف کا سیکنڈ کلاس کا ریل کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست اس پتہ پر بھیجیں: سید جلال الدین عمری سکریٹری ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی
پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ